رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

عدد ۳

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

دفتر رسالہ میثاق

رحمان پورہ اچھرہ - لاہور

۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ہندوستانی خریداروں کے لیے
ارسال زر کا پتہ
مینجر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

ماہنامہ میثاق لاہور

فہرست مضامین

جلد ۲ | بابت ماہ مارچ ۱۹۶۰ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۷۹ھ | عدد ۳

تذکرہ وتبصرہ ___ امین احسن اصلاحی ___ ۲

تدبر قرآن ___ تفسیر سورہ بقرہ ___ " ___ ۹

تزکیہ نفس
تزکیہ تعلقات ___ " ___ ۱۸

اسلامی قانون
عہد حاضر میں اجتہاد کی اہمیت ___ " ___ ۲۳

سفر حج
واپسی ___ " ___ ۳۰

مراسلہ ومذاکرہ
انسان کی فطرت اور اس کا طرز عمل ___ " ___ ۳۷

اجتماعیات وسیاسیات
ریاست کا اسلامی تصور ___ " ___ ۴۴

تقریظ وتنقید
قادیانیت ۔ المقالات الحسن ___ ۵۰

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اصلاح معاشرہ کی کسی عملی جدوجہد سے پہلے ضروری ہے کہ اپنے معاشرہ کی بیماریوں اور خرابیوں کو اچھی طرح سمجھا جائے۔

ہر معاشرہ کی طرح ہمارا معاشرہ بھی مختلف طبقات پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر طبقہ کی بیماریاں الگ الگ ہیں۔ جب تک ان تمام طبقات کے الگ الگ امراض کی تشخیص نہیں ہوگی اور یہ بات متعین ہو کر سامنے نہیں آئے گی کہ ان بیماریوں میں سے کون سی بیماریاں اصل مرض کی حیثیت رکھتی ہیں اور کن کی حیثیت محض علامات کی ہے اس وقت تک اصلاح کی ہر کوشش بے نتیجہ رہے گی۔ صحیح تشخیص کے بغیر اصلاح کی جدوجہد کرنے والے بسا اوقات اپنے ارادہ میں مخلص ہونے کے باوجود، اپنی ساری محنت ضائع کر بیٹھتے ہیں، یا تو وہ دق کے مریض کو موسمی بخار کا مریض گمان کر لیتے ہیں، یا کسی مرض کی علامت کو اصل مرض سمجھ لیتے ہیں یا کسی قلب کے مریض کا علاج کسی پیٹ کے معالج کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ ان تمام مغالطوں سے بچنے کے لیے ہم پہلے اپنے معاشرے کے تمام طبقات کی بیماریوں کی تشخیص کریں گے، اس کے بعد اسلام کی روشنی میں ان کے علاج بتائیں گے، اور پھر تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ اس علاج کے لیے کیا کام کیے جانے چاہئیں اور ان کاموں کی انجام دہی کے لیے کن صفات کے آدمیوں کے آگے آنے کی ضرورت ہے۔

ہم اپنے معاشرے کا جب جائزہ لیتے ہیں تو قدرتی طور پر ہماری نظر سب سے پہلے علماء کے طبقہ پر پڑتی ہے جن پر قوم کی اصلاح و ہدایت کی اصل ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے نیا تعلیم یافتہ طبقہ آتا ہے جو اس وقت عملاً ہماری قوم کے تمام خیر و شر پر حاوی ہے۔ اس کے بعد عوام کا طبقہ آتا ہے جن سے ہماری قوم درحقیقت عبارت ہے۔ (اہل سیاست کا ذکر ہم اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ اس وقت حالات نے ان کو گوشہ عزلت میں پھینک دیا ہے ورنہ اس جائزہ میں ان کی جگہ شاید سب سے زیادہ نمایاں ہوتی) اب آئیے ان تمام طبقات کا ایک سرسری جائزہ لے کر دیکھیے کہ ان کی وہ کیا خرابیاں اور کمزوریاں ہیں جن کے سبب سے ہمارا پورا معاشرہ ایک بالکل مریض معاشرہ بن کر رہ گیا ہے۔

ہمارے علماء و صوفیاء کا طبقہ اس اعتبار سے تو قابل قدر اور لائق احترام ہے کہ ان کی اکثریت اس دین و شریعت کا درد و احساس رکھتی ہے جس پر ایک اسلامی معاشرہ کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے اپنے دائروں کے اندر اس بنیاد کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ جدوجہد بھی کرتے رہتے ہیں اور ان کی اس جدوجہد سے کچھ نہ کچھ ہمارے معاشرے کو فائدہ بھی پہنچتا رہتا ہے، لیکن اس خوبی کے ساتھ ساتھ ان کے اندر چند خامیاں بھی ایسی ہیں جن کے سبب سے وہ اصلاح کی اس ذمہ داری کے ادا کرنے سے قاصر ہیں جو فی الواقع معاشرہ کے اصل ذمہ دار ہونے کی وجہ سے ان پر عاید ہوتی ہے۔ ہم حق نصیحت ادا کرنے میں مداہنت کرنے والے ٹھہریں گے اگر ان کی ان خامیوں کی نشان دہی نہ کریں۔

ہمارے نزدیک ان کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ان کے اندر وحدت فکر بالکل مفقود ہے۔ یہ طبقہ مختلف گروہوں میں بٹ گیا ہے اور ہر گروہ پر اس وقت مجموعی معاشرہ کی صلاح و فلاح سے زیادہ اپنے گروہ کی جتھہ بندی قائم رکھنے کی فکر غالب ہے۔

دوسری خامی یہ ہے کہ ان کی اکثریت کا علم دین محض تقلیدی ہے۔ ان کے اندر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے فکر و مطالعہ سے دین میں وہ بصیرت حاصل کی ہو جو دنیا پر دین کی حجت قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔

تیسری خامی یہ ہے کہ ان کا علم صرف دین کے علم تک محدود ہے۔ موجودہ زمانہ کے فکر و فلسفہ سے

یہ بالکل ناآشنا ہیں جس کے سبب سے ان کے لیے جدید فکر و فلسفہ کے علمبرداروں سے نبرد آزمائی مشکل ہے۔

چوتھی خامی یہ ہے کہ ان پر گوشہ نشینی اور خلوت گزینی کا مزاج، جو ان کے طرزِ تعلیم و تربیت کا قدرتی نتیجہ ہے، غالب ہے جس کے سبب سے عزیمت کا وہ داعیہ ان کے اندر بہت کم ابھرنے کا موقع پاتا ہے جو کسی نصب العین کو دنیا پر غالب کرنے یا کسی اصلاح کو بروئے کار لانے اور کسی فتنہ کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے شرط ضروری ہے۔

یہ چند بڑی بڑی خامیاں ہیں جو ہمارے دینی طبقہ کے اندر، جو ہمارا سب سے زیادہ محترم طبقہ ہے، عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ پھر ان خرابیوں سے دوسری خرابیاں پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے مل ملا کر ان میں سے ہر خیال کو ایک مرکب بیماری بنا دیا ہے جس کے سبب سے ان میں سے کسی بیماری کے علاج کی کوشش کے معنی بھی فتنوں کے دروازے کھول دینے کے مترادف بن گیا ہے۔ خاص طور پر ہمارے صوفیہ کے طبقہ میں ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جس کے اندر علمِ دین کی کمی کے ساتھ ساتھ بدعات نے بھی نہایت گہری جڑیں جما رکھی ہیں، اور ان جڑوں کو اکھاڑنا کوئی آسان کام نہیں رہ گیا ہے۔

ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی سب سے بڑی بیماری اسلام اور اسلامی شریعت سے متعلق اس کی بے یقینی ہے۔ ان لوگوں کی تعلیم و تربیت ایسے ڈھب پر ہوئی ہے کہ یہ لوگ اسلام کے متعلق یا تو کچھ جانتے ہی نہیں یا جانتے ہیں تو محض خاندانی روایات کے طور پر جانتے ہیں۔ انھوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھا ہے دلیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ برعکس اس کے اسلام کے متعلق ان کی معلومات محض سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ یہ سنی سنائی باتیں بھی زیادہ تر ان کے اپنے ہی ماحول کی ہیں جن کا زیادہ حصہ اسلام اور اسلامی زندگی کی تحقیر میں ہے، بہت تھوڑا ہی حصہ ایسا ہوگا جو اسلام کے حق میں ہو۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر مغربی فکر و فلسفہ اور مغربی طرزِ زندگی پر تو انھیں پورا اعتماد و یقین ہے کہ یہ انھیں کامیابی کی منزل پر لے جانے والے ہیں لیکن اسلام اور اسلامی طرزِ زندگی کی صحت پر ان کی اکثریت کو کوئی اعتماد نہیں رہ گیا ہے، خواہ وہ اپنی اس بے اعتمادی کا اظہار کریں یا نہ کریں۔

ان میں جو ذرا مصلحت اندیش اور محتاط ہیں، اسلام کی کھلم کھلا مخالفت کرنے کے بجائے ان کی پالیسی یہ ہے کہ فکر و اعتقاد اور تہذیب و معاشرت میں وہ پیروی تو کرتے ہیں اہلِ مغرب کی اور جہاں تک ان کا زور چلتا ہے وہ ہمارے معاشرہ کو بھی اسی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک یہی راہ ترقی کی راہ ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں مانتے کہ یہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اسلام کو چھوڑ کر کر رہے ہیں، بلکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ عین منشائے اسلام کی تکمیل میں کر رہے ہیں۔ ان کا سیدھا سادا نظریہ یہ ہے کہ اسلام تہذیب و ترقی کا مذہب ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ایسا اعلیٰ مذہب تہذیب و ترقی کی کسی بات میں مانع ہو، ان کا خیال یہ ہے کہ یہ محض مولویوں اور ملاؤں کا جمود ہے کہ وہ تہذیب و ترقی کی ان باتوں کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں۔

ان میں جو جری اور بے باک ہیں وہ کھلم کھلا اسلام اور اسلامی شریعت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کا یہ مذاق علانیہ ان کی تحریروں اور تقریروں میں نمایاں ہو کر سامنے آ رہا ہے۔ ایک گروہ ان میں سے روس کے دین کمیونزم کا مداح و معتقد ہے اور دوسرا امریکہ کے دین اور اس کی تہذیب و معاشرت پر فدا ہے۔ ان لوگوں کا سیدھا سادا فلسفہ یہ ہے کہ مذہب اور طرزِ زندگی وہی صحیح ہو سکتا ہے جو دنیوی ترقی کی راہیں کھولے جب ان قوموں کی ترکتازیاں مریخ اور چاند تک ہیں تو ان کا مذہب اور ان کا طرزِ زندگی غلط کس طرح ہو سکتا ہے؟ پھر یہیں سے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ یہ نتیجہ بھی نکال لیتے ہیں کہ شراب نوشی، زناکاری، سینما بازی، رقص و سرود، عریانی، بے حیائی اور فحاشی وغیرہ اگر قوموں کے اخلاق کو تباہ کرنے والی چیزیں ہوتیں تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ قومیں ان چیزوں میں آخری حدود لانگ جانے کے باوجود، ترقی میں چاند تک پہنچ جاتیں۔

ان میں کچھ عناصر کاروباری قسم کے بھی شامل ہیں جن کا دین صرف ان کا ذاتی مفاد ہے۔ انھوں نے اپنے ذمہ یہ کام لے رکھا ہے کہ دینِ مغرب کے پرستار جو قدم بھی اٹھائیں یہ پیچھے سے ان کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ جو قدم انھوں نے اٹھایا ہے یہ قدم ٹھیک اسی صراطِ مستقیم پر ہے جس کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا تھا لیکن عجمی سازشیوں نے یہ صراطِ مستقیم گم کر رکھی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ قرآن کی تحریف کرنے کی وہ ساری تدبیریں اختیار کر رہے ہیں جو یہود نے یا باطنیہ نے اختیار کی تھیں بلکہ بعض اعتبارات سے یہ لوگ چند قدم ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ جن کو اطمینان دلانے کے

لیے یہ لوگ خدا کے دین میں تحریفیں کر رہے ہیں چونکہ وہ قرآن و حدیث سے خود واقف نہیں ہیں اور ان لوگوں کی باتیں ان کی خواہشات کے مطابق ہوتی ہیں اس وجہ سے وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی خواہشات کی سند قرآن میں بھی موجود ہے۔ اگر وہ لوگ قرآن و حدیث سے خود واقف ہوتے تو شاید انھیں کچھ اندازہ ہو سکتا کہ قرآن کے نام سے ان کی آنکھوں میں کیا دھول جھونکی جا رہی ہے لیکن جب آگے چلنے والے خود دینی فکر و بصیرت سے محروم ہوں اور پیچھے سے حز دینے والے ان کے بھٹکتے رہنے ہی میں اپنا مفاد دیکھ رہے ہوں تو ایسے راہ چلنے والوں اور ایسے راہ دکھانے والوں کا اشتراک عمل جو نتیجہ پیدا کر سکتا ہے وہ معلوم ہے۔

اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کچھ سعید روحیں بھی پائی گئی ہیں جو غلط تعلیم اور غلط ماحول کے اندر بھی ہمیشہ دین کی متلاشی رہی ہیں لیکن ان کے اندر بھی ایک بہت بڑی کمی رہی ہے جس کے سبب سے یہ سعید روحیں بھی اکثر کسی نہ کسی فتنہ کا شکار ہو گئی ہیں۔ وہ کمی یہ ہے کہ ان کے پاس دین کا براہ راست کوئی علم نہیں تھا اس وجہ سے جب بھی کسی شخص نے اٹھ کر ذرا زوردار لب و لہجہ میں ان کی اصطلاحوں اور ان کے جذبات کے مطابق بات کر دی ہے تو انھوں نے اس کے ارد گرد حلقہ بنا لیا ہے اور جب یہ ایک مرتبہ کسی کے قلم یا اس کی زبان سے مسحور ہو گئے ہیں تو پھر اس کے چکر میں اس طرح پھنس گئے ہیں کہ اس کے حق کے ساتھ اس کے باطل کو بھی نگلتے چلے گئے ہیں۔ ان کے پاس پیتل اور سونے میں امتیاز کے لیے خود اپنی نگاہ نہیں ہوتی اس وجہ سے جس ہاتھ سے انھیں ایک سونے کا سکہ مل جائے اس کے ہاتھ سے یہ بڑی آسانی کے ساتھ دس پیتل کے کھوٹے سکے بھی قبول کر لیتے ہیں اور پھر ان کھوٹے سکوں کو سونے کے سکوں کے نام سے چلانے کے لیے اپنی وہ ذہانت و قابلیت صرف کرنا شروع کر دیتے ہیں جو جدید تعلیم سے انھیں حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ قادیانیت کی تحریک سے لے کر مشرقیت اور پرویزیت تک جتنی تحریکیں بھی اس ملک میں اٹھی ہیں اگر ان کا تجزیہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جدید تعلیم پائے ہوئے نیک بختوں کا ان میں سے ہر ایک میں خاصا حصہ رہا ہے اور یہ حصہ انھوں نے دین کے براہ راست علم سے محروم ہونے کے سبب سے عموماً بالکل بے بصرانہ ہی لیا ہے۔ بصیرت کے ساتھ حصہ لینے والے بہت تھوڑے نکلے ہیں۔

اب آئیے اپنے عوام کی حالت کا جائزہ لیجیے۔

ہمارے عوام کی سب سے بڑی بیماری جہالت ہے۔ ان کو نہ دنیا کا علم حاصل ہے اور نہ دین کا۔ ان کے پاس نہ اپنا دماغ ہے اور نہ اپنی زبان۔ یہ کیا سوچتے ہیں اور کیا مانگتے ہیں اس کی تعبیر انھوں نے خود اپنی زبان سے کبھی نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ دوسروں ہی نے ان کے ذہن کی تعبیریں پیش کی ہیں اور انھوں نے اپنی خاموشی سے ان میں سے ہر تعبیر کرنے والے کی تعبیر کی تصدیق کر دی ہے۔ لیکن اخلاقی و مذہبی نقطۂ نظر سے اگر ان کے حالات کا گہرا جائزہ لیا جائے تو دو حقیقتیں بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جس طرح ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کے فکر و فلسفہ اور انگلستان و امریکہ کی تہذیب و معاشرت سے مرعوب اور اس پر فریفتہ ہے، انہی کو اپنانا اور اختیار کرنا چاہتا ہے، اسی طرح ہمارے عوام کی اکثریت اپنے ان مغربی طرز کے لیڈروں کی زندگی سے مرعوب اور اس پر فریفتہ ہے۔ یہ اپنی عملی زندگی میں جس حد تک اختیار کر سکتے ہیں انہی کی زندگی اختیار کرتے ہیں اور جو حصہ اختیار نہیں کر سکتے اس کے اختیار کرنے کی دل میں تمنا رکھتے ہیں۔ ہم پروپیگنڈا کرنے اور دھونس جمانے کے لیے کتنی ہی بار یہ بات کہیں کہ ہمارے عوام اسلامی طرز زندگی کے لیے بے چین و بے قرار ہیں لیکن یہ بات ایمان داری اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارے عوام کو اسلام کے نام اور اس کے نعرے سے ایک عشق ضرور ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ یہ فی الواقع اسلامی زندگی سے عشق رکھتے ہیں محض مغالطہ ہے۔

دوسری یہ کہ ان میں جو مذہبی رجحان رکھنے والے ہیں وہ مختلف مذہبی جتھوں میں سے کسی نہ کسی مذہبی جتھے سے ضرور وابستہ ہیں اور ان کی یہ وابستگی اتنی شدید ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے جتھہ کے طریق و مسلک کی حمایت میں لڑنا مرنا موجب سعادت دارین سمجھتا ہے۔ یہ جتھہ بندی ایک صحیح اسلامی معاشرہ پیدا کرنے میں جس حد تک رکاوٹ بن سکتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے لیکن ہماری قوم کا جوڑ جوڑ اور بند بند اس جال کے پھندوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ماضی قریب میں ہمارے ملک میں جو تحریکیں مذہب کے نام سے اٹھیں انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس رجحان کی کوئی اصلاح نہیں کی بلکہ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان تحریکوں کے لیڈروں نے بھی اپنی کامیابی اسی میں سمجھی کہ جس طرح دوسرے بہت سے جتھے بنے ہوئے

ہیں اسی طرح یہ بھی اپنے اپنے جتھے بنا کے بیٹھ جائیں۔

ان سارے حالات کا جائزہ لیجیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ ہمارے معاشرہ کا بگاڑ ایک ہمہ گیر بگاڑ ہے۔ یہ بگاڑ صرف کسی ایک طبقہ یا کسی ایک گروہ ہی کا بگاڑ نہیں ہے، بلکہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں کسی ایک کے لے جانے سے نہیں جا رہے ہیں بلکہ ان کو دھکیلنے میں ہر ایک کے دست و بازو کی قوت شامل ہے، خواہ یہ شمولیت دانستہ ہو یا نادانستہ۔ ان حالات پر جب ایک شخص نگاہ ڈالتا ہے تو پہلی نظر میں اس پر مایوسی سی طاری ہو جاتی ہے کہ اس ہمہ گیر بگاڑ کی اصلاح بھلا کس کے بس میں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس صورت حال کی اصلاح کر دینا خدا کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہے لیکن اس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا ہمارے بس میں ضرور ہے اور ہم آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ مسئلہ کے اسی پہلو پر بحث کریں گے۔

(۲)

تفسیر آیۃ بسم اللہ و سورہ فاتحہ پریس میں جا چکی ہے۔ اس کے سرورق کے بلاک کی تیاری میں کچھ دیر ہو گئی اس وجہ سے کتاب کی اشاعت میں چند دنوں کی تاخیر ہو جائے گی۔

اس کے صفحات بھی اندازہ سے کچھ زیادہ ہو گئے ہیں اس وجہ سے قیمت بھی کچھ بڑھ جائے گی۔ یعنی ۱۲ر ہو گی۔

(۳)

میثاق کے آئندہ نمبر سے مولانا عبدالغفار حسن صاحب اس میں مطالعہ حدیث کا باب شروع کر رہے ہیں۔ قارئین تنہا میرے ہی مضامین پڑھتے پڑھتے اکتا گئے تھے، خدا نے تبدیل ذائقہ کا سامان کر دیا۔ مولانا کا مضمون ذرا تاخیر سے موصول ہوا، ورنہ اسی اشاعت میں دے دیا جاتا۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۸)

۲۳ - بعض دلائل کی وضاحت

اس مجموعہ آیات میں اسلام کے تینوں بنیادی عقائد — توحید، رسالت اور معاد کی بعض دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ اب ہم ان کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلی دلیل توحید کی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے:

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس سے پھل پیدا کیے تمہاری روزی کے لیے تو تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ درانحالیکہ تم جانتے ہو۔

(بقرہ - ۲۲)

توحید کی یہ دلیل اس توافق اور ہم آہنگی کے پہلو سے ہے جو اس کائنات کے تمام اضداد کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس کائنات میں ایک طرف تو زمین کے مقابل میں آسمان، شب کے مقابل میں روز، نور کے مقابل میں ظلمت، سردی کے مقابل میں گرمی اور عورت کے مقابل میں مرد کا وجود پایا جاتا ہے، جس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کائنات اضداد اور باہم نبرد آزما قوتوں اور طاقتوں کی ایک رزمگاہ ہے۔ چنانچہ یہی دھوکا بعض قوموں کو ہوا جس کے سبب سے انھوں نے نور اور ظلمت، نیکی اور

بدی کے الگ الگ خالق ٹھہرا لیے۔ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اہل عرب بھی زمین کے لیے الگ اور آسمان کے لیے الگ دیوتا مانتے تھے۔ قرآن مجید نے اسی مغالطہ کو یہاں رفع کیا ہے کہ اس کائنات میں جو تضاد نظر آتا ہے وہ محض ظاہری ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے تمام اضداد میں نہایت گہرے قسم کا توافق ہے۔ زمین تمہارے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان تمہارے اوپر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے۔ پھر دیکھو آسمان سے پانی برستا ہے اور اس پانی سے زمین میں طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور یہ پھل تمہارے لیے غذا کا کام دیتے ہیں۔ زمین اور آسمان کے درمیان اس طرح کے توافق کے ہوتے ہوئے یہ کس طرح باور کرتے ہو کہ زمین کے اندر کسی اور دیوتا کا ارادہ کارفرما ہے اور آسمان میں کسی اور کی خدائی چل رہی ہے۔ مختلف ارادوں کے تصرفات میں یہ موافقت اور یہ سازگاری کس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں مل کر ایک گہوارہ بنائیں اور اس گہوارے میں انسان کی اس طرح پرورش کریں جس طرح ماں بچے کی پرورش کرتی ہے؟ اس اختلاف کا نتیجہ تو یہ ہوتا تھا کہ یہ دونوں خود بھی درہم برہم ہو کے رہ جاتے اور ان کے ساتھ وہ بھی پس جاتے جو اس چکی کے دونوں پاٹوں کے بیچ میں آ جاتے۔

یہ دلیل بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ تم خدا کا کوئی ہمسر نہ ٹھہراؤ درانحالیکہ تم جانتے ہو۔ "تم جانتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کو مانتے ہو کہ زمین کا اس صورت پر پیدا ہونا اور آسمان کا اس شکل میں وجود میں آنا خدا ہی کی قدرت سے ہوا ہے، ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور نے نہیں بنایا ہے۔ اس اقرار کے بعد آسمان و زمین کے انتظام میں کسی کو خدا کا شریک ماننا ایک ایسی بے جوڑ بات ہے جس کا بے جوڑ ہونا بالکل واضح ہے۔ قرآن نے یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہنی چاہیے کہ مشرکین عرب، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، خدا کے منکر نہیں تھے۔ وہ خدا کو مانتے تھے البتہ وہ اس کے شریک ٹھہراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے سامنے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ صرف شرک کی تردید کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہاں دلیل اثبات باری کی نہیں دی گئی ہے بلکہ توحید کی دی گئی ہے۔ لیکن اس دلیل کو پیش کرنے کا انداز ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے ایک خالق اور پروردگار کا ثبوت اس سے آپ سے آپ ہو رہا ہے۔

یہاں اس دلیل کی اسی قدر وضاحت پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ آگے مختلف شکلوں اور اسلوبوں میں یہ دلیل آئے گی اور ہر جگہ موقع کے لحاظ سے اس کی وضاحت ہوگی۔ یہ دلیل ہم نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنے رسالہ حقیقت توحید میں بھی بیان کی ہے۔ جو لوگ مزید وضاحت کے طالب ہوں اس رسالہ کو پڑھیں۔

دوسری دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات کی دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا
عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا
وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ

(۲۴ - بقرہ)

اور اگر تم اس چیز کی طرف سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو پیش کرو اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم یہ نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکوگے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر۔ وہ کافروں کے لیے تیار کی ہوئی ہے۔

قرآن کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو اس نے اپنے مقرب فرشتے حضرت جبریلؑ کے ذریعہ سے بشکل وحی آپ پر اتاری ہے۔ آپ اس کتاب کو اپنی رسالت کے ثبوت میں پیش فرماتے تھے۔ مشرکین عرب آپ کے اس دعوے کے مخالف تھے اور ان کی اس مخالفت میں یہود بھی ان کے ہم نوا تھے بلکہ درپردہ وہی اس مخالفت کو ہوا دینے والے تھے۔ یہ لوگ اس مخالفت میں مختلف قسم کی باتیں کہتے تھے۔ کبھی کہتے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خود اپنی تصنیف ہے جس کو یہ ہمارے اوپر اپنی نبوت کی دھونس جمانے کے لیے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، کبھی کہتے کہ کچھ لوگ ان کے شریک سازش ہیں اور وہ اس کتاب کی تیاری میں ان کی مدد کرتے ہیں، کبھی کہتے کہ جس طرح شاعروں اور کاہنوں پر جنات القا کرتے ہیں اسی طرح ان پر بھی کوئی جن یہ کلام القا کرتا ہے، کبھی دعویٰ کرتے کہ یہ کلام کوئی مافوق کلام نہیں ہے، ہم بھی چاہیں تو اس قسم کا کلام بڑی آسانی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے وہ اس کے ایک خدائی کلام ہونے کو جھٹلانا چاہتے تھے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کی تردید ہو سکے اور یہ کتاب

آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل نہ بن سکے۔

ان ساری باتوں کے جواب میں یہ فرمایا گیا کہ اگر تمہیں اس طرح کے شکوک و شبہات ہیں تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی کے ساتھ یوں ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کے مانند کوئی سورہ پیش کر دو۔ اگر تم نے اس کے مانند ایک سورہ بھی پیش کر دی تو ثابت ہو جائے گا کہ تمہارے خیالات صحیح ہیں اور قرآن کا دعویٰ غلط ہے۔

پھر آخری اتمام حجت کے طور پر قرآن نے اپنی اس تحدی کے ساتھ تین باتیں شامل کر دیں۔

ایک یہ کہ اس کتاب کے مانند کوئی ایک ہی سورہ پیش کرو۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے ان لوگوں سے یہ بات کہی گئی تھی کہ اس کے مانند کوئی کتاب پیش کرو اور پھر یہ بات کہی گئی کہ اس کے مانند دس سورتیں پیش کرو۔ جب وہ ان دونوں مطالبوں میں سے کوئی بھی پورا کرنے کی ہمت نہ کر سکے تو آخری بات یہ کہہ دی گئی کہ چلو، ایک ہی سورہ اس کے مانند پیش کر کے دکھاؤ۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ اگر تمہارے لیے تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام مشکل ہو تو تمہارے پاس ادیب بھی ہیں، خطیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، کاہن بھی ہیں، جنات بھی ہیں، شیطان بھی ہیں اور تمہارے بہت سے دیوی دیوتا بھی ہیں، قرآن کا مقابلہ کرنے کے لیے تم ان سب کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر ان سب کی مدد بھی تمہاری اس مشکل کو آسان نہ کر سکے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس قرآن کو خدا کی کتاب مانو اور اس کو جھٹلانے کی کوشش میں بے فائدہ اپنی قوت ضائع نہ کرو۔

تیسری بات یہ کہی گئی کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تو تم آج کر سکے اور نہ کبھی آئندہ کر سکو گے۔ اس وجہ سے اس سعی لاحاصل میں اپنی دنیا اور آخرت برباد کرنے کے بجائے اس عذاب سے بچنے کی فکر کرو جس سے اس کتاب کی تکذیب پر جمے رہنے کی صورت میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔

قرآن کے اس چیلنج کے اصل مخاطب اگرچہ اہل عرب تھے، غیر اہل عرب کے لیے اس قسم کے چیلنج کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن قرآن کے ہر مخالف اور رسالت محمدی کے ہر منکر کے لیے خواہ وہ عرب سے تعلق رکھتا ہو یا عجم سے، قرآن کے زمانۂ نزول سے لے کر آج تک یہ چیلنج موجود ہے۔ جس کا جی چاہے وہ اپنے زور اور اپنی قابلیت کا امتحان کر لے، اسے خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہ

قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورہ کے مانند بھی کوئی کلام پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔

تیسری دلیل قیامت کی دی گئی ہے، وہ اس طرح بیان ہوئی ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

(بقرہ ۲۸ - ۲۹)

تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تمہیں مارتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۔ وہی ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے پھر اس نے آسمان کے بنانے کا قصد کیا اور ہموار کر دیے سات آسمان اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہاں کفر سے مراد خدا کا انکار نہیں بلکہ، جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، قیامت کا انکار ہے کیونکہ قیامت کا انکار درحقیقت خدا کی تمام اعلیٰ صفات — قدرت، ربوبیت، حکمت اور علم — کا انکار ہے۔ جو شخص ان صفات کے بغیر خدا کو مانے اس کا خدا کو ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہے۔ اس وضاحت کے بعد اب دیکھیے یہاں قیامت کی کیا دلیل بیان ہوئی ہے۔

پہلے معاد کے ممکن ہونے کی دلیل دی گئی ہے۔ یہ وہی عام عقلی اور فطری دلیل ہے جو قرآن مجید میں مختلف پیرایوں اور اسلوبوں میں بیان ہوئی ہے کہ جب تم یہ مانتے ہو کہ خدا نے تم کو عدم سے وجود بخشا اور یہ بھی دیکھتے ہو کہ وہی خدا ہے جو تم کو زندگی کے بعد موت دیتا ہے تو پھر اس بات کو کیوں ناممکن سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ جس کے لیے پہلی بار پیدا کرنا ممکن ہوا آخر اس کے لیے دوبارہ پیدا کر دینا کیوں ناممکن ہو جائے گا؟

لیکن کسی چیز کے ممکن ہونے سے یہ لازم نہیں ہو جاتا کہ وہ ضرور واقع بھی ہو کے رہے۔ قیامت کا واقع ہونا ممکن سہی لیکن آخر اس کی ضرورت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جس خدا نے تمہاری پرورش کے لیے یہ سارا جہان بنایا اور اپنی پروردگاری کی یہ شانیں دکھائیں، جس کی قدرت اس کائنات کے ہر گوشہ سے نمایاں ہو رہی ہے اور جس کی حکمت کی شہادت ذرہ ذرہ سے مل رہی ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تم کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دے اور تمہارے نیکوں اور بدوں میں کوئی امتیاز نہ کرے۔

کی یہ بھاریں چھپی ہوئی ہیں، بے بصیرت لوگ اس کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ اس کی نہایت حقیقت افروز تمثیلات کو بہانہ بنا کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اس کا ایک جلوہ بھی دیکھ پاتے تو اس کی سیر سے کبھی آسودہ نہ ہوتے۔

۲۵- آگے کا سلسلہ کلام

بنی اسمٰعیل کو مذکورہ بالا دعوت دینے اور ان کو یہود کی چالوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرنے کے بعد آگے کی دس آیتوں (۳۰ - ۳۹) میں آدمؑ کی خلافت اور شیطان کی طرف سے اس کی مخالفت کی سرگذشت بیان ہوئی ہے۔ یہ سرگذشت اپنے اندر بہت سے حقائق رکھتی ہے جن کی تفصیل تو اپنے اپنے مواقع پر آگے آئے گی لیکن یہاں بطور تمہید اس کے اس پہلو کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے جس پہلو سے یہ سرگذشت پچھلے سلسلہ کلام سے مربوط ہوتی ہے۔

یہ سرگذشت ایک آئینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس ردعمل کی پوری تصویر دکھائی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول سے یہود پر خصوصاً اور وقت کی بعض دوسری جماعتوں پر عموماً نمایاں ہوا۔ یہود اپنے حسد اور تکبر کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بن گئے اور برابر اس دشمنی پر جمے رہے۔ اس کے برعکس دوسرے بہت سے لوگ، جو حسد اور تکبر کی بیماری میں مبتلا نہیں تھے، اگرچہ اول اول حقیقت کے اچھی طرح واضح نہ ہونے کے باعث بعض شبہات میں مبتلا ہوئے لیکن جوں جوں ان کے شبہات دور ہوتے گئے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ قرآن نے یہ دکھایا ہے کہ یہ ردعمل بہت کچھ مشابہ ہے اس ردعمل سے جو آدمؑ کی خلافت کے فیصلہ سے ابلیس اور فرشتوں پر ہوا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کی خبر فرشتوں کو دی تو اول اول انھیں بھی اس فیصلہ کے بارے میں بعض شبہات پیش آئے اور انھوں نے اپنے یہ شبہات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش بھی کیے لیکن وہ شبہات محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم ان پر واضح نہیں ہوئی تھی، جوں ہی پوری اسکیم ان کے سامنے آگئی ان کے سارے شبہات دور ہو گئے اور وہ آدمؑ کی خلافت پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو گئے۔ برعکس اس کے ابلیس کو آدمؑ کی خلافت پر جو اعتراض تھا وہ حسد اور تکبر کی بنا پر

تھا، اس نے خیال کیا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آدم مٹی کا ایک پتلا ہے پھر اس کے مقابلہ میں آدم کو خلافت کا یہ منصب کیوں ملے اور یہ نسلی برتری رکھتے ہوئے وہ آدم کو سجدہ کیوں کرے؟

قرآن نے دکھایا ہے کہ بالکل اسی سرگذشت کا اعادہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ جو لوگ حق طلب اور معقولیت پسند ہیں ان کو اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت یا قرآن کے کسی پہلو میں تردد تھا تو وہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد دور ہو گیا ہے یا دور ہو جائے گا لیکن یہود کی ساری مخالفت حسد اور تکبر پر مبنی ہے، وہ نسب کے اعتبار سے بھی اپنے آپ کو بنی اسمٰعیل کے مقابل میں افضل سمجھتے ہیں اور اپنی قدیم دینی سیادت و پیشوائی کے غرہ میں مذہبی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو امی عربوں کے بالمقابل برتر خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان پر یہ بات بڑی شاق گذر رہی ہے کہ وہ ایک امی نبیؐ کی رسالت کا اقرار کر کے اپنے اوپر امیوں کی سیادت تسلیم کر لیں اور دنیا کی امامت کا جو منصب ان کو اب تک حاصل رہا ہے اس سے دستبردار ہو جائیں۔

اس تصویر میں قرآن نے یہود کا اصل مقام متعین کر دیا ہے کہ ان کا پارٹ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی مخالفت میں بعینہٖ وہی ہے جو ابلیس کا پارٹ حضرت آدمؑ کی مخالفت میں رہا ہے۔ دونوں کی مخالفت کے اسباب و محرکات بالکل ایک ہی قسم کے ہیں۔ اشارۃً یہ بات بھی ظاہر کر دی ہے کہ دونوں کا انجام بھی ایک ہی ہوگا جس طرح ابلیس کی مخالفت کے علی الرغم آدمؑ کی خلافت قائم ہو کے رہی اسی طرح یہود کی مخالفت کے علی الرغم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت و نبوت بھی قائم ہو کے رہے گی۔

نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ کسی واقعی شبہ کی بنا پر کسی خلش کا پیدا ہو جانا یا کسی اعتراض کا اٹھانا کوئی معیوب بات نہیں ہے، نیک اور معقول لوگوں کے دلوں میں بھی اس طرح کی خلشیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کے سبب سے کسی چیز پر وہ اعتراض بھی کر گذرتے ہیں لیکن ان کے اعتراض کے پس پردہ چونکہ حسد یا تکبر کا کوئی داعیہ چھپا ہوا نہیں ہوتا اس وجہ سے جوں ہی ان کے شبہ کے اسباب دور ہوئے وہ پورے شرح صدر کے ساتھ امر حق کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ یہ گویا ایک نہایت لطیف اسلوب سے ان لوگوں کے لیے ایک دعوت ایمان ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اگرچہ ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن ان کا ایمان نہ لانا کسی حسد اور تکبر کی بنا پر نہیں ہوا تھا بلکہ صرف اس وجہ سے تھا کہ آپ کے دعوے اور آپ کی دعوت کے بعض پہلو ابھی ان پر اچھی طرح روشن نہیں ہوئے تھے — اس سلسلہ کلام کو سامنے رکھتے ہوئے اب آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ (باقی آئندہ)

تزکیۂ نفس

امین احسن اصلاحی

تزکیۂ تعلقات

تزکیۂ نفس حصہ دوم کے مباحث میثاق کے قارئین ان صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ اب اللہ کا نام لے کر تزکیۂ نفس حصہ سوم کے مباحث کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ ان مباحث کا تعلق تزکیۂ تعلقات و معاملات سے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس طرح پچھلے دونوں حصوں کی تکمیل کی سعادت حاصل ہوئی اسی طرح اس تیسرے حصہ کے مباحث کی تکمیل کی بھی توفیق حاصل ہو۔ اس کتاب کے پہلے دونوں حصے کتابی شکل میں ملک برادرز لائل پور کے زیر اہتمام شائع ہو رہے ہیں۔ توقع ہے کہ جلدی ہی ان کی اشاعت کا اعلان ان صفحات میں بھی ہو سکے گا۔

امین احسن اصلاحی

تعلقات میں سب سے پہلے جو تعلق زیر بحث آتا ہے وہ آدمی کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہے۔ اسی تعلق کے صحیح شعور اور اسی کی صحیح معرفت سے آدمی کو دوسرے تعلقات کے صحیح حقوق و فرائض کی شناخت حاصل ہوتی ہے اس وجہ سے ہم سب سے پہلے ان اساسات اور بنیادوں کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے جن پر خدا کے ساتھ ہمارا تعلق قائم ہے۔ اس کے بعد ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ اسلام نے ہمارا تعلق ہماری ذات کے ساتھ کن بنیادوں پر قائم کیا ہے، ہمارے خاندان، قبیلہ اور قوم کے ساتھ کن اصولوں پر قائم کیا ہے، ہماری حکومت اور ریاست کے ساتھ ہمارے تعلق کی اساسات کیا ہیں اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہم کن روابط کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان تمام تعلقات کی بنیادیں اگر واضح ہو کر سامنے آجائیں اور آدمی ہر غلط بندھن کو توڑ دے اور

ہر صحیح رشتہ کو استوار کرے تو وہ اپنے رب کا فرمانبردار بندہ، اپنے خاندان اور کنبے کا ایک لائق فرد، اپنی ریاست کا ایک خیرخواہ اور وفادار شہری اور دنیا میں ایک سچا محب انسانیت بن جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو حاصل کر کے درحقیقت ایک انسان ایک صحیح تربیت یافتہ اور ایک پاکیزہ انسان بنتا ہے اور اسی طرح کا تربیت یافتہ اور پاکیزہ انسان بنانا اس تزکیہ کا اصل مقصود ہے جس کی تعلیم حضرات انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ اگر انسان کے ان تعلقات کا کوئی گوشہ بھی ناہموار رہ جائے تو صرف یہی نہیں کہ اس گوشہ میں وہ تزکیہ کی برکت سے محروم رہتا ہے بلکہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کے دوسرے گوشوں میں بھی ناہمواریاں اور خرابیاں موجود ہیں۔ ہماری زندگی کے یہ تمام پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا بناؤ یا بگاڑ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

خدا کے ساتھ تعلق کی بنیاد قرآن مجید کے تدبر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح طور پر اس صورت میں قائم ہوتا ہے جب ہم اپنے آپ کو خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت ہمارے دل، ہماری روح اور ہمارے ارادے سے ایک خاص مطالبہ کرتی ہے۔ اگر ہم یہ تمام مطالبے ٹھیک ٹھیک پورے کر دیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اپنے رب کے ساتھ اپنے تعلق کو بالکل صحیح بنیاد پر قائم کر لیا۔ درحقیقت یہی تقاضے ہیں جن کی تفصیلات شریعت میں بیان ہوئی ہیں اور قرآن مجید میں اکثر احکام و ہدایات کے بیان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کا جو حوالہ آتا ہے وہ درحقیقت اسی بات کو واضح کرنے کے لیے آتا ہے کہ یہ مطالبہ یا یہ ہدایت خدا کی فلاں صفت کا تقاضا ہے۔ جو شخص شریعت کے احکام و ہدایات پر اس شعور کے ساتھ عمل کرتا ہے کہ فلاں حکم یا فلاں ہدایت کے اندر خدا کی فلاں صفت کا جلوہ ہے، وہی شخص درحقیقت شریعت کی اصلی روح کو پہچانتا ہے۔ شریعت کے احکام پر جب وہ عمل کرتا ہے تو اس طرح عمل کرتا ہے کہ گویا وہ اس عمل کے اندر خدا کے جلوہ کو دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ خدا کی بندگی اور اطاعت اس طرح کرتا ہے گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ بندہ کا خدا کو دیکھنا یہی ہے کہ شریعت کے ہر حکم کے اندر خدا کی صفات کا جو عکس ہے وہ اس کو نظر آتا ہے اور جب وہ عکس اس کو نظر آتا ہے

تو وہ صاف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس حکم کے اندر خدا کی نگران آنکھیں چھپی ہوئی
قرآن مجید کی تلاوت کیجیے تو آپ کو ہر حکم اور ہدایت کے ساتھ خدا کی کسی
ضرور ملے گا۔ کہیں ایک بات فرمائی جائے گی اور اس کے ساتھ یہ آئے گا کہ خدا
ایک بات کا حکم دیا جائے گا اور ارشاد ہوگا خدا علیم و حکیم ہے۔ کہیں کسی چیز
اس کے ساتھ یہ تنبیہہ ہوگی کہ خدا قوی و عزیز ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ
ہے کہ تمام دین و شریعت درحقیقت خدا کی صفات کا ایک مظاہرہ ہے، آدمی
طرح شریعت کے رنگ میں رنگ لے تو اس نے اپنے آپ کو گویا صبغۃ اللہ میں
بات بہ واضح ہوئی کہ شریعت کے احکام کی پابندی کا اصلی مزا صرف اس شخص کو
شریعت کے احکام کے اندر خدا کی صفات کے جمال و جلال کو دیکھ رہا ہو۔
جلال کے مشاہدے سے محروم رہتے ہیں ان کی دینداری بالکل رسمی اور رواجی دیندا
کے اندر اول تو پائداری نہیں ہوتی اور پائداری ہوتی بھی ہے تو اس کے اندر رو

ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ یہاں ایک غلط فہمی سے آگاہ کردینا نہایت ضرو
خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بننا اور چیز ہے اور خدا کی صفات کا م
کرنا ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ شریعت انسان کا تعلق خدا کے ساتھ جو جوڑتی
نصب العین اور مطمح نظر یہ ہے کہ بندہ اپنے ظاہر و باطن دونوں میں خدا کی صفا
کے مطابق بن جائے۔ شریعت میں بندے کے لیے کمال کا سب سے بڑا درجہ
اور جد و جہد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر کمال کا کوئی درجہ ہے تو و
لیکن وہ اکتسابی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے۔ اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے یہ مرتبہ دیا
لیکن جوگیوں اور راہبوں کے تصوف میں، بالخصوص اس تصوف میں جس کی بنیا
کے نظریہ پر ہے، مطمح نظر خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھ
بلکہ خدا کی صفات کے مظہر بننے کا ہے۔ اس میں مجاہدہ اور ریاضت کا اصل مقصود یہ
عبدیت کا کمال درجہ حاصل کرلے بلکہ سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ آدمی
اس طرح مظہر بن جائے کہ قطرہ دریا میں ضم ہو جائے اور دوئی اور تفرقہ کے سارے

و فرائض کے علم و عمل کی راہ میں جتنا ہی بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی خدا سے اس کا قرب بھی بڑھتا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کی ذمہ داریاں بھی مشکل سے مشکل تر اور نازک سے نازک تر ہوتی جاتی ہیں۔

اصل بحث سے پہلے یہاں یہ تنبیہہ میں نے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ جو گیانہ تصوف کے بعض غلط اثرات اُس تصوف میں بھی گھس آئے ہیں جس کو مسلمانوں نے اختیار کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض ذہنوں میں وہ غلط فہمی بھی موجود ہو جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اگر یہ غلط فہمی موجود ہو تو آدمی پر تزکیہ کے اس نظام کی اصل قدر و قیمت واضح نہیں ہو سکتی جس کی طرف کتاب و سنت میں رہنمائی کی گئی ہے اور جس کے اصول و مبادی میں واضح کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔

تصوف پر ہمارے متقدمین نے جو کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کی قدر و قیمت کا میں بہت قائل ہوں۔ لیکن ان کتابوں اور ان کے لائق احترام مصنفین کے واجبی احترام کے باوجود میری دیانت داری کے ساتھ رائے یہ ہے کہ ان میں مقامات کی جو تشریح کی گئی ہے اس میں اکثر جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بات کتاب و سنت کے حدود سے آگے نکل گئی ہے۔ ایک چیز کا جو اعلیٰ معیار وہ پیش کرتے ہیں اگر کتاب و سنت کی کسوٹی پر اس کو پرکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ مقام کتاب و سنت کے مقام سے ایک مافوق مقام ہے۔ یہاں تک کہ اگر اصل معیار اس کو مان لیجیے تو صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس معیار پر شاید ہی پورے اتر سکیں۔ اس چیز کا اثر طبیعت پر یا تو مایوسی کی شکل میں پڑتا ہے، آدمی یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ باتیں ہمارے دائرہ جد و جہد سے باہر ہیں، یا پھر کتاب و سنت سے اس کو یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ ان میں جو معیار پیش کیا گیا ہے، وہ صرف عام معیار ہے۔ عبدیت و انابت وغیرہ کا حقیقی معیار وہ ہے جو اہل تصوف پیش کرتے ہیں۔

میں آگے کے مباحث میں ہر چیز کا وہی معیار پیش کروں گا جو اس کا کتاب و سنت میں قائم کیا گیا ہے، اور یہی میرے نزدیک اصل اور حقیقی معیار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہو سکوں۔

★

اسلامی قانون

امین احسن اصلاحی

عہدِ حاضر میں اجتہاد کی اہمیت

(تقریر جو ۱۱ جنوری سنہ ۶۶ء کی شام کو لاء کالج لاہور کے ہال میں جسٹس محمد شریف صاحب کی صدارت میں کی گئی)

فاضل صدر اور حاضرین!

میں پہلے مختصر طور پر اجتہاد کی حقیقت واضح کروں گا اس کے بعد عہد حاضر میں اس کی اہمیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔

عربی زبان میں اجتہاد کے معنی انتہائی اور بھرپور کوشش کرنے کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ عربی زبان کا صرف ایک لفظ ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی اصول قانون کی ایک نہایت اہم اصطلاح بھی ہے۔ اسلامی قانون کے تین اہم اور بنیادی ماخذ ہیں — کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجتہاد — اسلام نے قانون اخذ کرنے کی ترتیب یہ مقرر کی ہے کہ جب ہماری زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس کے بارے میں ہمیں خدا کا قانون معلوم کرنا ہو تو سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا چاہیے اگر اس میں کوئی واضح بات نہ ملے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اگر اس میں بھی کوئی واضح بات نہ ملے تو پھر اجتہاد کرنا چاہیے۔ یعنی پھر کتاب و سنت کے اشارات، ان کے مقتضیات و مضمرات، عہد نبویؐ کے امثال و نظائر، صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے تعامل، اور شریعت اسلامی کے مزاج کو سامنے رکھ کر اس پیش آمدہ صورت کے لیے حکم متعین کرنا چاہیے۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کتاب و سنت کے واضح نصوص سے کوئی حکم معلوم کرنا ہو تو یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اگر ایک آدمی عربی زبان سے واقف ہو تو وہ یہ کام آسانی سے کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں واضح نصوص کے بجائے اشارات، مقتضیات، قیاس، استنباط اور امثال و نظائر وغیرہ سے کام لے کر خود ایک حکم لگانا یا فتویٰ دینا ہے تو یہ کام کوئی آسان کام نہیں رہ جاتا، بلکہ ایک بڑا مشکل فنی کام بن جاتا ہے۔

اس کے لیے سب سے پہلے تو یہ چیز دیکھنی پڑتی ہے کہ آدمی کو اسلامی قانون کی اصل زبان یعنی عربی میں پوری مہارت ہو کیونکہ پوری مہارت کے بغیر کوئی شخص کسی زبان کے اشارات و اسالیب اور اس کے استعمالات کو اس طرح نہیں سمجھ سکتا کہ ان کی رہنمائی میں پیش آمدہ حالات کے لیے حکم یا قانون اخذ کر سکے۔ جو شخص اسلامی قانون کی اصل زبان سے اچھی طرح واقف ہو وہی معلوم کر سکتا ہے کہ ایک قانون جو بیان ہوا ہے تو اس کے الفاظ کا ظاہری مفاد کیا ہے۔ اس کے اشارات سے کیا باتیں نکلتی ہیں اور اس کے معنوی تقاضے کن حقائق کی طرف رہبری کر رہے ہیں۔ اس طرح کی باریکیاں ہر زبان میں ہوتی ہیں اور قانون میں ان باریکیوں کی ہر شخص جانتا ہے کہ بڑی اہمیت ہے۔ اس میں کاما اور ڈیش کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلامی قانون کے اجتہادات پر جب آپ نظر ڈالیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ بعض معاملات میں اہل اجتہاد کے اجتہادات صرف اس وجہ سے مختلف ہو گئے کہ بعض اہل اجتہاد قرآن کے کسی لفظ پر وقف یا ٹھہراؤ کے قائل ہیں، دوسروں کے نزدیک وہ ٹھہراؤ معتبر نہیں ہے۔ زبان کی انہی مشکلات اور نزاکتوں کی وجہ سے اسلامی اصول قانون (اصولِ فقہ) میں ایک طویل بحث الفاظ و اسالیب کے تقاضوں کی وضاحت کے لیے بھی ہوتی ہے اور آپ اگر اس کا مطالعہ کریں گے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس بحث کا بہت بڑا حصہ اسلامی قانون سے براہِ راست تعلق رکھنے والا ہوتا ہے، اس کو سمجھے بغیر کوئی شخص اسلامی قانون میں اجتہاد کے لوازم نہیں پورے کر سکتا۔ اب غور کیجیے کہ جب صورت حال یہ ہے تو کوئی شخص جو اسلامی قانون کی اصل زبان میں مہارت کا درجہ نہ رکھتا ہو وہ یہ مشکل کام کس طرح انجام دے سکتا ہے؟

دوسری چیز جو اس کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اصل قانون کے مآخذ، اس کے تدریجی ارتقا، اس کے نظام و ترتیب، اس کی ترجیحات و تخفیفات اور اس کے اجتہادی ذخائر پر نگاہ رکھتا ہو۔ اسلامی قانون پر عمل اور اجتہاد کی صدیاں گذری ہیں اس کے اصول اجتہاد کے مختلف اسکول

بن چکے ہیں اور یہ اصولِ اجتہاد ایک مرتب فلسفہ کی شکل میں موجود ہے۔ جب تک کوئی شخص ان ساری چیزوں پر گہری نظر نہ رکھتا ہو اس کے لیے نہ سابق اجتہادات کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ممکن ہے اور نہ کسی نئے اجتہاد کے لیے صحیح نظری مواد فراہم کرنا ممکن ہے۔

انہی اسباب سے اجتہاد کے کام کو ایک مشکل کام بتایا گیا ہے اور اسلام میں اس کے لیے وہی شخص اہل قرار دیا گیا ہے جو اسلامی قانون کی اصل زبان اور ساتھ ہی اسلامی قانون میں مہارت رکھتا ہو۔ یہ مہارت جس مسلمان کو حاصل ہو وہ اسلام میں اجتہاد کا مجاز ہے۔ عام اس سے کہ وہ شخص آزاد ہے یا غلام، مرد ہے یا عورت، عجمی ہے یا عربی۔ اس وجہ سے یہ محض ایک غلط فہمی ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مولویوں نے اجتہاد پر اپنا اجارہ قائم کر رکھا ہے۔ اجتہاد پر کسی طبقہ یا گروہ کا اجارہ نہیں ہے بلکہ قانونِ اسلامی کے ماہرین کا اجارہ ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی شخص یہ مہارت بہم پہنچا لے تو اس کو اس حقِ اجتہاد سے کوئی شخص محروم نہیں کر سکتا۔ برعکس اس کے اگر ایک شخص علما ہی کے طبقہ سے تعلق رکھنے والا ہو لیکن اسلامی قانون میں اس کو مہارت حاصل نہ ہو تو اسلام کے شرائطِ اجتہاد کی رو سے اسے بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اجتہاد کرے۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اجتہاد کے معنی کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ اظہار رائے کے ہیں۔ ان لوگوں کا غالباً یہ خیال ہے کہ جس چیز کے بارے میں کتاب و سنت کے اندر کوئی حکم موجود نہ ہو اس میں ہر شخص مجرد اپنی عقل کی رہنمائی میں اظہار رائے کر سکتا ہے اور یہی چیز ہے جس کو اسلام نے اجتہاد کہا ہے۔ بلکہ بعض لوگوں کے بیانات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خود اسلامی قانون کو بدل دینے کا نام اجتہاد رکھتے ہیں۔ جو لوگ اجتہاد کے یہ من مانے مفہوم سمجھتے ہیں قدرتی طور پر ان کو یہ بات کچھ گراں سی گذرتی ہے کہ اسلام میں یہ تصرف کرنے کا حق علماء کو تو حاصل ہو لیکن ان کو حاصل نہ ہو۔ لیکن میں نے آپ کے سامنے اجتہاد کا جو مفہوم واضح کیا ہے اس سے آپ کو یہ اندازہ بخوبی ہو گیا ہو گا کہ اجتہاد کے معنی نہ تو کسی قانونی مسئلہ پر مجرد اظہار رائے کے ہیں اور نہ اسلامی قانون کو بدل دینے کے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں کتاب و سنت کے واضح نصوص کی رہنمائی موجود نہ ہو وہاں ان کے اشارات اور تقاضوں سے رہنمائی حاصل کرنا۔

اجتہاد کی اہمیت

اجتہاد کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد اب آئیے اس کی اہمیت کے پہلو پر غور کیجیے۔

ایک آزاد معاشرہ کے اسلام پر قائم رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے دیئے ہوئے احکام و قوانین پر عمل کرے۔ اگر کسی معاملہ میں اس کو خدا اور رسول کی تعلیمات میں کوئی واضح حکم نہ ملے تو پھر ان کے اشارات و مقتضیات کی روشنی میں اجتہاد کر کے خدا اور رسول کے احکام سے قریب تر حکم معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ یہ اجتہاد غلط بھی ہو سکتا ہے، صحیح بھی ہو سکتا ہے لیکن مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اس طرح کی صورتوں میں خدا اور رسول کی رہنمائی کی طلب سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرے۔ اگر کوئی معاشرہ اس چیز سے بے نیاز ہو جائے تو اس کی پوری زندگی غیر اسلامی ہو جائے گی اگرچہ وہ اپنی زندگی کے بعض گوشوں میں اسلامی احکام و قوانین ہی پر چل رہا ہو۔

اس وجہ سے خدا اور رسول کے ساتھ اپنے رشتہ کو استوار رکھنے کے لیے ہم اس بات کے محتاج ہیں کہ جن معاملات میں ہماری رہنمائی کے لیے خدا اور رسول کے واضح احکام نہیں ہیں ان میں یا تو ہم دوسرے مجتہدین کے اجتہادات کو اختیار کریں یا اجتہاد کے شرعی اصولوں پر اجتہاد کر کے ان کے بارے میں احکام متعین کریں۔ بغیر اس کے اسلام کے ساتھ ہمارا تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ اس وجہ سے اگر یہ کہا جائے کہ ہم اپنی مادی زندگی کے بقا کے لیے جتنے محتاج ہوا اور پانی کے ہیں اس سے زیادہ محتاج ہم اپنی روحانی زندگی کے بقا کے لیے اجتہاد کے ہیں تو اس بات میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔

اجتہاد کی یہ اہمیت کل بھی تھی، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ جو معاشرہ خدا اور رسول کے احکام و قوانین کے تحت زندگی بسر کرنا چاہے گا اس کے لیے اجتہاد سے مفر نہیں ہے۔ لیکن اس دور میں اس کی اہمیت کے بعض نئے پہلو بھی نمایاں ہوئے ہیں اور عنوان تقریر مجھ سے یہ تقاضا کر رہا ہے کہ میں ان کی طرف بھی اجمال کے ساتھ اشارہ کروں۔

ایک جامع اسلامی ضابطۂ قوانین کی تدوین کی خواہش

اس وقت لوگوں کے اندر یہ عام خواہش پائی جاتی ہے کہ اسلامی قانون کو جدید طرز پر ایک ضابطۂ قوانین کی شکل میں مرتب کر دیا جائے تاکہ حکومت اور عدالتوں کے لیے اس کی مراجعت آسان ہو جائے۔ یہ خواہش ہمارے معاشرے کی ایک اہم ضرورت کے احساس سے پیدا ہوئی ہے۔ اس ضرورت ہی کے تحت آپ جانتے ہیں کہ اس جلسہ کے فاضل صدر

کی قیادت میں اسلامی قانون کی تدوین کے لیے ایک کمیشن بھی ایک زمانہ میں مقرر ہوا تھا۔ ہمارے معاشرہ کی یہ ضرورت اور یہ خواہش جب ہی پوری ہوگی اس کے پورے ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی ایک فقہ کی تقلید کے بجائے اس مقصد کے لیے پوری اسلامی فقہ کو اچھی طرح کھنگال کر ایک جامع ضابطۂ قوانین ضروریات زمانہ کے مطابق بنایا جائے۔ مختلف اسلامی فقہوں کو اس نگاہ سے دیکھنا اور ان کے مختلف اقوال و مذاہب میں سے کسی ایک قول و مسلک کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھ کر اختیار کرنا، یہ بھی اجتہاد ہے۔ اس اجتہاد کے بغیر آپ اپنے معاشرہ کی یہ ضرورت پوری نہیں کر سکتے۔ اگر کسی ایک ہی فقہ کی تقلید پر اس کام کی بنیاد رکھی گئی تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس صورت میں موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق کوئی ضابطۂ قوانین مرتب کرنا نہایت مشکل ہے۔

سائنس کی ترقیوں کے پیدا کردہ مسائل

اسی طرح سائنس کی غیر معمولی ترقیوں نے بھی اس دور میں بہت سے نئے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل پیدا کر دیئے ہیں جو اگلے مجتہدین کے زمانوں میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان مسائل پر اسلام کی روشنی میں غور کر کے اگر اس دور کے اصحاب اجتہاد نے کوئی رہنمائی نہ دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ ان مسائل میں من مانے طور پر رائیں قائم کریں گے اور اسلام کے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا ہوں گے کہ وہ اس سائنٹفک دور کے حالات و مسائل کے لیے اپنے اندر کوئی رہنمائی نہیں رکھتا۔

میں اس موقع پر اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے مسائل پر انفرادی طور پر جو رائیں ظاہر کی جا رہی ہیں، خواہ علمائے دین کی طرف سے یا غیر علمائے دین کی طرف سے، ان سے ایک ذہنی انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس طرح کے مسائل پر صحیح رائے قائم کرنے کے لیے مذہب کے گہرے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے اور ان سوالات کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو فی الواقع سائنس کی ترقیوں نے پیدا کر دیئے ہیں اس وجہ سے علماء اور غیر علماء دونوں ہی گروہوں کے لیے میرا ناچیز مشورہ یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل پر اپنے اپنے طور پر اظہار رائے کے بجائے اجتماعی طور پر غور کرنے اور رائے قائم کرنے کی کوئی شکل اختیار کریں تاکہ وہ اپنے معاشرے کو صحیح رہنمائی دے سکیں۔

اجتہاد کے لیے دو باتوں کا اہتمام

بہرحال جہاں تک اجتہاد کی اہمیت و ضرورت کا تعلق ہے اس کی اہمیت و ضرورت، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، نہ پہلے کم تھی نہ اب کم ہے۔ البتہ اس اجتہاد کو عنداللہ

مقبول اور عند الناس قابلِ اعتماد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام وہ لوگ کریں جو علمی اور اخلاقی دونوں ہی اعتبارات سے اس کے لیے اہل اور موزوں ہوں۔

میں اس موقع پر ایک ضروری بات آپ کو یاد دلا دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ مسلمانوں میں اجتہاد کو چھوڑ کر تقلید کی راہ اختیار کرنے کا جو میلان پیدا ہوا، تو وہ یوں ہی اتفاق سے نہیں پیدا ہو گیا، بلکہ اس کے دو بڑے سبب ہوئے ہیں۔

ایک سبب اس کا یہ ہوا کہ جب دین سے بے پروا امراء و سلاطین نے اقتدار حاصل کیا اور دنیا پرست علماء ان کے درباروں سے وابستہ ہوئے تو ان علماء نے ان امراء کے دباؤ سے یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خدا کی شریعت میں بے جا تصرفات کیے اور ایسے فتوے لکھے جو صریحاً دین فروشی کی نوعیت کے تھے۔ جب اس طرح کے فتوے اور احکام لوگوں کے سامنے آئے تو لوگ ان امراء اور ان علماء سے بدگمان اور متنفر ہوئے اور انھوں نے اپنے دین اور اپنی آخرت کی سلامتی اسی چیز میں دیکھی کہ ان دنیا پرست علماء کے اجتہادات پر عمل کرنے کے بجائے اپنے ان اسلاف کے اجتہادات اور فتووں کی تقلید کریں جن کے متعلق وہ جانتے تھے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر تو ان جابر و ظالم امراء و سلاطین کے ہاتھوں سارے مصائب و شدائد جھیل لیے لیکن خدا کے دین میں کسی دراندازی کے لیے انھوں نے کوئی راہ کھلنے نہ دی۔

دوسرا سبب اس کا یہ ہوا کہ جب مسلمانوں میں امراء و سلاطین کی سرپرستی سے یونانی فلسفہ اور عجمی علوم کا زور ہوا اور یہی علوم سرکاری تقرب کے وسیلے بنے تو شریعت کے علوم سے لوگوں کی دلچسپی بہت کم ہو گئی اور اس میں مہارت حاصل کرنے کا وہ ولولہ لوگوں کے اندر سرد پڑ گیا جو اجتہاد کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ چیز بھی منجملہ ان اسباب کے ایک ہے جس سے مسلمانوں میں تقلید کا رجحان ترقی پایا ہے۔ لوگ مجتہد کے اندر امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا کمال فن ڈھونڈتے تھے، جب لوگوں نے بعد والوں کو اس سے خالی پایا تو اس چیز نے ان کے تقلید کے رجحان کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔

اب اگر تقلید کو ختم کرنا اور اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہے تو یہ ایک مبارک کام ہے، اس کو شوق سے کیجیے، کوئی آپ کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا لیکن اجتہاد کے بند دروازے کو کھولنے سے پہلے ان

اسباب کو دور کرنا ضروری ہو گا جو اس کے بند ہونے کے باعث ہوئے تھے۔ اگر یہ اسباب دور نہ ہوئے تو یاد رکھیے کہ اجتہاد کا دروازہ کھول دینے کے باوجود بھی بند ہی رہے گا کیونکہ ان لوگوں کے اجتہادات کو قبول کرنے کے لیے مسلمانوں کے دل ہمیشہ بند ہی رہیں گے جو علمی اور اخلاقی اعتبار سے اس کارِ عظیم کے لیے موزوں نہیں ہوں گے۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ اپنے آپ کو علمی اور اخلاقی دونوں اعتبارات سے اجتہاد کا اہل بنائیے۔ اس لاء کالج سے اگر آپ صرف وکالت کی سندیں حاصل کریں تو یہ تو کوئی بڑا کام نہیں ہوا۔ ہماری آرزو تو یہ ہے کہ اس کالج سے اسلامی قانون کے وہ ماہرین پیدا ہوں جو دنیا پر اسلامی قانون کی حجت قائم کر سکیں اور جو اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے اتنے مضبوط اور بے لچک ہوں کہ مسلمان ان پر یہ بھروسہ کر سکیں کہ یہ کسی خوف یا کسی طمع سے مرعوب یا متاثر ہو کر خدا اور اس کے رسول کے ساتھ بے وفائی اور چالبازی نہیں کریں گے۔ قانون کے متعلق آپ حضرات جانتے ہیں کہ تمام عدل و انصاف کا انحصار اسی پر ہوتا ہے، اس وجہ سے قانون اور اہلِ قانون سے متعلق ہر قوم میں ذمہ داری اور احترام کا ایک خاص احساس پایا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ چیز دوسروں کی نسبت سے کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون بادشاہوں، پارلیمنٹوں اور قانون ساز اداروں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ خدائے احکم الحاکمین کا اتارا ہوا ہے۔ اس میں اجتہاد کا جو حق ہمیں ملا ہے وہ خدا اور رسول کی طرف سے ایک مقدس امانت ہے۔ اس کے استعمال کرنے میں اگر ہم ذرا بھی نفس کی جنبہ داری میں مبتلا ہو جائیں تو اس سے ہم اپنی آخرت بھی تباہ کر لیں گے اور دوسرے بندگانِ خدا کی آخرت بھی خطرے میں ڈال دیں گے۔

چراغِ راہ کا سالنامہ
فروری ۱۹۶۰ء کے آخر میں آ رہا ہے
• قانون نمبر کے بعد دوسری شاندار پیشکش
• مقالے • مشاہیر اسلام کے غیر مطبوعہ خطوط • نئے افسانے
• تازہ منظومات اور — مولانا مودودی سے مکہ ریڈیو کا انٹرویو
• مولانا مودودی کا سفرنامہ ؛ صفحات ۱۵۰ — قیمت ۸ر
پتہ: دفتر چراغ راہ - ۲۳ - اسٹریچن روڈ - کراچی ۱

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

واپسی

حج کے بعد کی ایک ماہ کی مدت معلوم ہوا کہ پلک جھپکتے گذر گئی۔ جب وطن کو واپسی کے دن قریب آگئے تو دل کے اندر ایک عجیب کشمکش سی شروع ہو گئی۔ جب یہ خیال آتے کہ اب ہم فلاں روز وطن کے لیے روانہ ہو جائیں گے تو اس خیال سے ایک بڑی گہری خوشی ہو، لیکن ساتھ ہی جب یہ خیال آئے کہ اب ہم حرم سے جدا ہو جائیں گے اور معلوم نہیں زندگی میں اس گھر کی زیارت پھر کبھی حاصل ہوگی یا نہیں تو اس تصور سے ایک ناقابلِ بیان صدمہ بھی ہو۔ دیدِ حرم کی اس کشمکش سے ہر ایک کو سابقہ پیش آتا ہوگا، یہ تجربہ کچھ میرے ہی لیے خاص نہیں تھا، لیکن آخری دنوں میں میرے اندر یہ کشمکش اتنی سخت ہو گئی کہ اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

اس دوران میں اس سوال پر میں نے بار بار غور کیا کہ بیت اللہ کے ساتھ یہ تعلق محض جذباتی ہی ہے یا اس میں کچھ دخل عقل کو بھی ہے۔ میرے دل نے اس سوال کا ایک ہی جواب ہر بار دیا کہ اس گھر پر اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک خاص پرتو ہے جس کا عکس ہر اس شخص کے دل پر پڑتا ہے جو اس گھر میں ایمان و اسلام کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔

مکہ معظمہ سے روانگی روانگی کے لیے ہم نے یہ سوچا کہ لاری سے سفر کرنے کے بجائے ہم کوئی اسٹیشن ویگن کرایہ پر کرلیں۔ یہ ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ لاریاں اپنی سواریوں کی متعین تعداد پوری کرنے کے لیے بسا اوقات کئی کئی گھنٹے معلموں کے ڈیروں کا طواف کرتی رہتی ہیں جس سے آدمی مکہ معظمہ کی گرمی اور دھوپ میں بڑا خراب ہوتا ہے۔ لیکن یہاں قاعدہ یہ ہے کہ کوئی حاجی لاریوں سے سفر کرے یا نہ کرے اسے لاریوں کا کرایہ ضرور بھرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے شکل یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنے اس کرایہ

کے حق استعمال سے جو پہلے ہی جمع کرا لیا جاتا ہے، دستبرداری لکھنی پڑتی ہے۔ ہم نے مذکورہ بالا زحمت کے پیش نظر یہ نقصان گوارا کیا اور کرایہ کے حق استعمال سے دستبرداری لکھ دی۔

روانگی کا دن روانگی کے دن متعینہ وقت پر گاڑی ہمارے دروازے پر آگئی اور اپنی روایت کے مطابق ہمارے معلم سید عقیل عطاس صاحب بھی ٹھیک وقت پر اپنے آدمیوں کے ساتھ آپہنچے... اور نیچے ایک دکاندار کے تخت پر بیٹھ گئے۔ ان کے آدمیوں نے ہمارا سارا سامان اوپر سے نیچے اتارا، اور قرینہ سے گاڑی میں رکھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم کو آخری طواف کرنا اور اس بابرکت شہر سے جدا ہونا تھا۔

آخری طواف میں نے جب آخری طواف کے لیے حرم کا رخ کیا تو اس وقت میرے دل پر وطن کو روانگی کی خوشی سے زیادہ حرم سے جدائی کے صدمہ کا احساس تھا۔ جس چیز پر میری نگاہ پڑتی تھی اس پر سے اٹھنے کا نام نہیں لیتی تھی کہ اب اس مقدس شہر کی اس چیز کو پھر کبھی دیکھنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ میں حرم میں داخل ہوا تو مجھے ہر چیز پر ایک عجیب اداسی سی معلوم ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے اپنے دل کی حالت کا ایک عکس تھا جو مجھے ہر چیز پر نظر آرہا تھا ورنہ حرم کی رونقوں میں بھلا کہاں فرق آتا ہے۔ میں نے طواف کیا، حطیم میں اور مقام ابراہیمؑ میں نفلیں پڑھیں، حرم کے مختلف گوشوں پر وداعی نگاہیں ڈالیں لیکن اس دوران میں برابر میں کھویا کھویا سا رہا۔ مطاف کے پلیٹ فارم سے بالکل متصل ایک حبشی خاتون بیٹھا کرتی تھیں جن کے پاس بعض لوگ اپنے جوتے طواف کے وقت حفاظت کے لیے رکھ دیا کرتے تھے۔ میں بھی بالعموم اپنے جوتے انہی کے پاس چھوڑتا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے وقت ان کی خدمت میں کچھ نذر پیش کی، اور ساتھ ہی یہ فقرہ میری زبان سے نکلا کہ "ماں جی! اب ہم تو چلے، دعا کرو کہ خدا پھر یہ گھر دکھائے"۔ انھوں نے میرے لیے دعا کی۔ اس وقت میرا دل بھر آیا۔ میں نے مڑ کر بیت اللہ پر آخری نظر ڈالی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنی زندگی کا آخری ورق الٹ رہا ہوں۔ باب ابراہیمؑ کی سیڑھیوں کے پاس میں آکے کھڑا ہو گیا۔ میرا دل صدمہ سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ میں وہاں بڑی دیر تک کھڑا رہا اور وہاں سے بیت اللہ کا جتنا حصہ نظر آرہا تھا اس کو دیکھتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گھر کو کتنا محبوب بنایا ہے۔ باب ابراہیمؑ کی دہلیز سے جدا ہوتے ہوئے میرے دل پر جو کچھ گذری بعض عرب شاعروں نے اپنے شعروں میں اس کی بڑی سچی تصویر کھینچی ہے لیکن وہ اور کوچے کی باتیں ہیں اور یہ ایک دوسرے ہی عالم کی باتیں ہیں اس وجہ سے دل نہیں چاہتا کہ ان واردات کے بیان کے لیے ان شاعروں کے الفاظ مستعار لوں۔

جدہ کو روانگی ظہر کے بعد آخری فرائض سے فارغ ہو کر سارے رفقاء جمع ہو گئے اور ہم جدہ روانہ ہونے کے لیے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ معلم صاحب اور ان کے آدمیوں نے ہمیں رخصت کیا اور ہم نے ان کی خدمات اور ان کے اخلاص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کو رخصت کیا۔ عام طور پر جو لوگ حج سے واپس لوٹتے ہیں وہ اپنے معلموں سے شاکی لوٹتے ہیں۔ الحمد للہ ہمیں اپنے معلم صاحب سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ اس کی جہاں ایک وجہ یہ تھی کہ معلم صاحب نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی وہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے معلم صاحب کو کبھی کسی ایسے کام کی زحمت نہیں دی جس سے ہم خود عہدہ برآ ہو سکتے ہوں۔ ہم نے سفر کو برابر سفر سمجھا۔ گھر کی راحتیں حاصل کرنے کی کبھی تمنا نہیں کی۔

جس وقت ہماری گاڑی روانہ ہوئی اور صفا کی پہاڑی کے چکر کے پاس سے ہم نے بیت اللہ پر آخری نظر ڈالی ہے تو دل کی جو حالت ہوئی ہے وہ بیان میں نہیں آسکتی۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ حرم کو آخری بار دیکھ لو اور دعا کرو کہ خدا یہ گھر پھر دکھائے۔

ہمارا یہ سفر سخت دھوپ کے وقت ہوا لیکن دل کچھ اس طرح کھویا کھویا سا رہا کہ نہ سردی کا احساس تھا نہ گرمی کا۔ اس دوران میں ہم صرف ایک مرتبہ ذرا سا بیدار ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری گاڑی اس نشان کو عبور کرنے لگی ہے جو حدود حرم پر بطور ایک نشان فاصل کے لگا ہوا ہے۔ یہاں دل نے ایک مرتبہ اور جدائی کی بڑی سخت کسک محسوس کی۔ اس نشان کو پار کرتے ہی ہم پھر اسی دنیا میں آگئے جس دنیا سے نکل کر اس پاک علاقہ میں گئے تھے۔

مدینۃ الحجاج میں جب ہم جدہ کے مدینۃ الحجاج میں پہنچے تو یہ دیکھ کر بڑی تشویش ہوئی کہ یہاں سخت اژدحام ہے۔ نہ صرف یہ کہ تمام کمرے بھرے ہوئے تھے بلکہ بہت سے حاجی کپڑے تان تان کر مدینۃ الحجاج کے صحن ہی میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ لیکن جوں ہی ہم پہنچے غالباً مصر کے کچھ حاجیوں نے ایک کمرے کا ایک گوشہ خالی کیا۔ ہم بغیر کسی مزاحمت کے ان کی جگہ پر قابض ہو گئے۔ اگرچہ اس کمرے میں بمبئی کے علاقہ کے کچھ ایسے حاجی ٹھہرے ہوئے تھے جن کی خواتین کا لباس بالکل غیر شرعی تھا جس سے طبیعت کو برابر ایک تکدر سا رہا۔ لیکن اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے رہے کہ ہم مدینۃ الحجاج کے صحن میں ڈیرے ڈالنے کی مصیبت سے محفوظ رہے۔

ملاقاتیں جدہ سے مجھے برابر کچھ مخلصین کے پیغامات ملتے رہے تھے کہ وہ مجھ سے ملنا اور بعض مسائل پر تبادلہ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہلا رکھا تھا کہ واپسی کے وقت ان شاء اللہ ملاقات کا وقت نکالوں گا۔ جدہ میں ہمیں پورا دن صرف ایک ہی گزارنے کا موقع ملا۔ اس وجہ سے ان مخلصین کو اطلاع دینا تو میرے لیے مشکل تھا لیکن ہمارے معلم کے وکیل کے ذریعہ سے جو لوگ ہماری واپسی کا پروگرام معلوم کر سکے تھے وہ مختلف اوقات میں مل لیے۔ یہاں کے اکثر مخلصین جماعت اسلامی سے میری علیحدگی کے وجوہ معلوم کرنے کے خواہش مند تھے۔ میں نے ان میں سے بعض کو ٹالنے کی کوشش کی اور بعض کو ان کے سوالوں کے مناسب جواب دے دیئے۔ یہاں کی بعض ملاقاتوں کا مختصر طور پر میں ذکر کروں گا۔

سید عبداللہ عباس صاحب ندوی یہ جدہ ریڈیو میں ملازم ہیں۔ یہ بڑے اخلاص سے ملے انھوں نے جدہ ریڈیو سے نشر کرنے کے لیے مجھ سے ایک انٹرویو لینے کی خواہش کی۔ میں نے ان سے معذرت کر دی کہ سفر کی اس رواروی اور اس بے اطمینانی میں یہ خدمت انجام دینا میرے لیے مشکل ہے۔ میری اس معذرت کی دو وجہیں تھیں۔ اول تو مجھے یہ لیڈرانہ قسم کی حرکت کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی، ثانیاً میں نے محسوس کیا کہ جس قسم کا پیغام میں دے سکتا ہوں وہ انھیں شاید پسند نہ آئے اور جو انھیں پسند آئے گا ممکن ہے اس پر میرا دل مطمئن نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ معذرت کر دوں۔

میری اس معذرت کے بعد انھوں نے دو قسم کے سوال نامے مرتب کر کے مجھے پکڑائے۔ ایک میں جماعت اسلامی سے میری علیحدگی کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دوسرے میں سعودی حکومت اور اس کی خدمات سے متعلق میرے تاثرات دریافت کیے گئے تھے۔ میں نے یہ سوالنامے اپنے پاس رکھ لیے اور ان سے وعدہ کیا کہ خدا نے چاہا تو جہاز میں ان کے جوابات نوٹ کر کے کراچی سے پوسٹ کر دوں گا۔ جس وقت میں نے وعدہ کیا تھا اس وقت میرا خیال یہی تھا کہ میں ان سوالوں کے جواب ضرور دوں گا۔ لیکن افسوس ہے کہ میں یہ وعدہ پورا نہ کر سکا۔ جہاں تک جماعت اسلامی سے متعلق سوالات کا تعلق تھا ان کا تو جواب دینے کو جی ہی نہیں چاہا۔ البتہ سعودی حکومت سے متعلق میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن جہاز میں سوار ہوتے ہی اس سفرنامہ کا خیال، جو اب تک کچھ مذبذب سا تھا، پختہ ہو گیا۔ اس خیال کے پختہ ہو جانے کے بعد مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ جو کچھ لکھنا ہے، اس سفرنامہ ہی کے

لکھوں گا۔ اب اس سفرنامہ نے اس خلاف وعدگی کی تلافی اگرچہ ایک حد تک کردی ہے لیکن مجھے مولانا سید عبداللہ عباس صاحب سے شرمندگی ضرور ہے کہ میں ان کی ایک مخلصانہ خواہش وعدہ کرنے کے باوجود پوری نہ کرسکا۔ امید ہے مولانا میری اس غلطی کو معاف فرمائیں گے۔

خطاط زادہ عبدالملک سلمہ یہاں اپنے ایک پرانے شاگرد عزیزی عبدالملک سلمہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ جس زمانے میں میں اخبار مدینہ (بجنور) میں ملازم تھا اس زمانے میں انھوں نے عربی کے کچھ ابتدائی سبق مجھ سے لیے ہیں۔ یہ مراد آباد کے مشہور کاتب عبدالقیوم خاں خطاط کے (جنھوں نے مولانا آزادؒ کے ترجمان القرآن کی کتابت کی ہے) صاحبزادے ہیں۔ خاں صاحب سے میرے محبانہ روابط تھے۔ اس تعلق سے یہ میرے پاس آجاتے اور میں ان کو کچھ بتادیا کرتا۔ میرا پڑھانا وڑھانا تو خیر کیا رہا ہوگا، بچوں کو پڑھانے سے مجھے زیادہ مناسبت کبھی نہیں رہی ہے، لیکن ان عزیز نے میرے اس پڑھانے کی بڑی قدر کی۔ انھوں نے میرے بعد بہت کچھ پڑھا اور شاید بہت کچھ پڑھایا بھی ہوگا لیکن یہ ان کی سعادت مندی ہے کہ میری حقیر خدمت کا اعتراف برابر کرتے رہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے نہ کہ "پیر ما خس است اعتقاد ما بس است"۔ اس ناچیز کے ساتھ ان کا معاملہ اسی ضرب المثل کے مطابق ہے۔

یہ ایک عرصہ سے تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور اب کچھ مدت سے عرب قبائل میں تبلیغ دین کے ارادہ سے مدینہ منورہ میں جا بیٹھے ہیں۔ میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا، تو یہ کسی تبلیغی دورے پر نکلے ہوئے تھے اس وجہ سے مجھ سے ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ جدہ میں آکر ملاقات ہوئی اور اس ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی۔ ان کی نیکی اور سعادت مندی سے تو میں ان کے بچپنے سے واقف تھا لیکن اس ملاقات سے اندازہ ہوا کہ اب طبیعت پر شوق تبلیغ کا اس قدر غلبہ ہے کہ اس شوق کے آگے زن و فرزند اور عیال و خانماں سب سے بے نیاز و بے پروا ہوگئے ہیں۔ میں نے ان سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ یہاں معاش کے لیے کیا کرتے ہو؟ انھوں نے اس سوال کا ایسا قلندرانہ جواب دیا کہ مجھے اپنے اس دنیادارانہ سوال پر تھوڑی سی شرمندگی ہوئی ـــــ یہ عزیز جدہ کے چند گھنٹوں کے قیام میں کئی بار ملنے آئے اور جب آئے تو کوئی نہ کوئی تحفہ بھی لے کے آئے۔ یہ جہاں رہیں میری دعا ہے کہ خوش رہیں اور اللہ کے دین کی کوئی خدمت کرتے رہیں۔

سعید رمضان صاحب یہاں سعید رمضان صاحب سے ملاقات کی توقع پہلے سے تھی۔ چنانچہ عبداللہ

بن کلیب نے اطلاع دی کہ وہ فندق قصر قریش میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ جس شام کو ان سے ملاقات کے لیے جانا تھا اس شام کو میرے پاس بہت سے مخلصین جمع ہوگئے اور ان سے باتیں کرنے میں اتنی دیر ہوگئی کہ سعید رمضان صاحب کے پاس جانے کے لیے موزوں وقت باقی نہیں رہ گیا۔ میں نے ان کو فون کرایا کہ اب ملاقات کے لیے موزوں وقت باقی نہیں رہا ہے اس لیے دور ہی سے سلام عرض کرتا ہوں اور حاضر نہ ہوسکنے کی معافی چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہلایا کہ نہیں میں شب کے ۲ بجے تک (حجاز کے وقت سے جہاں مغرب کے وقت ۱۲ بجتے ہیں) انتظار کروں گا، ضرور آؤ۔

تھوڑی دیر میں عبداللہ بن کلیب گاڑی لے کر آگئے اور میں ان سے ملنے کے لیے فندق قصر قریش پہنچا۔ یہ ہوٹل بڑا شاندار ہے۔ مجھے تو بالکل ہمارے لاہور کے فلیٹی کی طرح معلوم ہوا۔ اسی ہوٹل میں کامل شریف صاحب سیکرٹری موتمر اسلامی اور بعض دوسرے لیڈر اور اخبار نویس حضرات ٹھہرے ہوئے تھے۔ سعید رمضان صاحب نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ میں سعید رمضان صاحب کے پاس ان سے باتیں کرنے کے لیے بیٹھ گیا اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کامل شریف صاحب سے انٹرویو لینے میں مصروف ہوگئے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ ہم مختلف مسائل پر باتیں کرتے رہے۔ عراق کے حوادث ابھی بالکل تازہ تھے اس وجہ سے قدرتی طور پر گفتگو کا موضوع زیادہ تر وہی رہے۔ رخصت ہوتے وقت جب سعید رمضان صاحب زینے سے نیچے مجھے چھوڑنے آئے اور میں نے ان سے رخصتی مصافحہ کیا ہے تو میرا دل بھر آیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی بہت متاثر ہیں۔

بندرگاہ پر صبح کو ہمیں سر دھانا سے وطن کے لیے روانہ ہونا تھا اس وجہ سے میں نے تمام مخلصین سے کہلا دیا کہ چونکہ میں سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوں گا اس وجہ سے کوئی صاحب ملاقات کے لیے زحمت نہ اٹھائیں۔ صبح ہم نے اپنا سامان تیار کیا اور جہاز کے قلیوں کی ایک پارٹی نے آکر ہمارے سارے سامان پر اپنا ایک خاص نشان لگا دیا۔ مسافر خانہ سے جہاز تک ہم سرکاری لاریوں سے بھی جا سکتے تھے لیکن ہم نے انتظار اور کشمکش سے بچنے کے لیے یہ پسند کیا کہ ایک ٹیکسی کرلیں۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ایک ٹیکسی آئی اور ڈرائیور نے اس میں ہمارا سامان بھرنا شروع کیا۔ ہم پانچ آدمی تھے اور ہم سب کا سامان مل ملا کر اچھا خاصا ہوگیا تھا۔ گاڑی بالکل چھوٹے ماڈل کی تھی۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ گاڑی ایک ہی مرتبہ میں ہم کو اور ہمارے سارے سامان کو لے جاسکے گی لیکن ڈرائیور کی اسکیم یہی تھی کہ ہمارے پورے قافلہ اور سارے سامان کو وہ ایک ہی چکر میں پہنچائے گا۔ چنانچہ وہ ہنس ہنس کر ہمارا سامان گاڑی کے اوپر اور نیچے بھرتا رہا اور حکیم صاحب کھڑے احتجاج

کرتے رہے۔ بالآخر اس نے سارا سامان بھر لینے کے بعد ہمیں بھی دعوت دی کہ آؤ اس میں گھسو۔ ہمیں اس میں کوئی گھسنے کی جگہ تو نظر آتی نہیں تھی لیکن اس نے نہ صرف ہم ہی پانچ آدمیوں کو اس میں بھر لیا بلکہ ہمارے قلیوں کی پارٹی کے ایک نمائندے کو بھی اس نے اسی میں گھسا لیا۔ میں اس گاڑی کے جہاز تک پہنچنے سے بالکل مایوس تھا لیکن ڈرائیور برابر ہنستا اور باتیں کرتا رہا اور میں نے پانچ منٹ میں دیکھا کہ گاڑی ہمارے جہاز سردھنا کی سیڑھیوں کے نیچے کھڑی ہے۔

سردھنا جہاز کے عرشہ پر

سردھنا جہاز وہی جہاز ہے جس سے ہم ایک روز جدہ کے ساحل پر اترے تھے۔ اس یار آشنا کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ہم جس وقت پہنچے ہیں سوار ہونے والوں کی ایک لمبی قطار سیڑھیوں پر چڑھنے کے لیے کشمکش کر رہی تھی اور لوگوں کے سامان کرینوں سے اٹھا اٹھا کر جہاز کے عرشے پر پھینکے جا رہے تھے۔ میرے ساتھی تو کسی نہ کسی طرح جہاز پر پہنچ گئے لیکن میں کشمکش سے بچنے کے لیے جہاز کے پھیلے ہوئے سایہ میں کھڑا ہو گیا۔ اسی دوران میں کسٹم والوں کا ایک سپاہی آیا اور اس نے ہمارے سامان کے چند گتے کے ڈبوں کے کھولنے کا مطالبہ کیا۔ اس کے اس مطالبے نے سخت الجھن پیدا کر دی۔ ہم نے کیا یہ تھا کہ ہمیں شعبہ امر بالمعروف وغیرہ کی طرف سے کچھ کتابیں جو تحفہ میں ملی تھیں یا جو کتابیں ہم نے خریدی تھیں وہ ساری کتابیں بازار سے ولایتی مالوں کے خالی ڈبے خرید کے ان میں بھر لی تھیں اور ان کو اچھی طرح رسیوں سے باندھ دیا تھا۔ کسٹم والے کا کہنا یہ تھا کہ ان ڈبوں پر جن چیزوں کے لیبل لگے ہوئے ہیں ان کے اندر سامان بھی وہی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے، ان میں کتابیں ہیں جو ہم نے یہیں سے خریدی ہیں۔ اس نے کہا انھیں کھولنا ہوگا۔ میں نے کہا یہ ناممکن ہے۔ میرے اور اس کے درمیان یہ ردو بدل ہو ہی رہی تھی کہ اتنے میں ایک صاحب انگریزی سوٹ میں نمودار ہوئے۔ وہ بڑے تپاک سے سلام و مصافحہ کرکے مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ پھر ایک حکمانہ انداز سے انھوں نے کسٹم والے سے کوئی بات کہی جس کے سنتے ہی وہ وہاں سے چل دیا۔ اس کے بعد انھوں نے میرا سارا سامان اپنے سامنے کرینوں میں بھروا کے اوپر بھجوا دیا۔ یہ فرشتہ رحمت ایک پاکستانی تھے جو سعودی حکومت میں کوئی عہدہ دار ہیں۔ یہ مجھ سے ملنے کے شوق میں وہاں بالکل وقت کے وقت پہنچے تھے۔ میں ان سے باتیں تو صرف چند ہی منٹ کر سکا لیکن ان کے اس احسان اور اس عزت بخشی کی یاد عرصہ تک میرے دل میں باقی رہے گی۔ (باقی صفحہ ۴۳ پر)

مراسلہ و مذاکرہ

سوالات

مندرجہ ذیل سوالات بے حد اضطراب کا باعث بنے ہوئے ہیں ازراہِ کرم جتنی جلدی ہو سکے ان کے جوابات دیجیے۔

(۱) تاریخ انسانی کو پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل حق کی تعداد ہر زمانہ میں کم رہی ہے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت سلیم نہیں ہے، جب کہ قرآن مجید کا دعویٰ اس کے برعکس ہے۔ آخر کسی چیز کی فطرت کا اندازہ اس کے طرزِ عمل کی تاریخ ہی سے مستنبط کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی فطرت تو سلیم ہے مگر اکثر اس کے بھٹک جانے کے بھی امکانات رہیں کیونکہ وہ ایک امتحان گاہ میں رہ رہا ہے، مگر محال معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سلیم کے ہوتے ہوئے وہ بھٹک جائے؟ آخر اس کی فطرت کے متعلق حکم لگانے کے لیے اس کے مسلسل طرزِ عمل کو نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہی حال شرک کا ہے۔ آدمی کتنی ہی کوشش کرے کسی نہ کسی پیمانے میں شرک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے؟ یہ حال ایک مسلمان کا ہوتا ہے، جسے احکام شریعت کا پتہ ہوتا ہے۔

(۲) جب کہ تاریخ کی گواہی ہے کہ زمانہ میں مشرکین و کفار کی تعداد زیادہ رہی ہے اور قیامت بھی جب تسلیم کر لی جائے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رحیم، اکرم ذاتِ خداوندی نے دوزخ ہی کو بھرنے کا پلان کیا ہوا ہے؟ اس سے جزا سزا کے عقیدہ میں شک گزرتا ہے۔

(۳) یہ کائنات ایک امتحان گاہ ہے اور اس کے ہر فرد سے آخرت میں باز پرس ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ختم نبوت کے بعد ہر نفس پر اتمام حجت کا کام قلیل، غافل، اور اکثر اپنی راہ سے بھٹک جانے والی، اپنے فرائض کو پس پشت ڈال دینے والی امت پر چھوڑ دیا گیا ہے اس میں کیا حکمت ہے؟

(۴) حضرت ابو ہریرہؓ کا وہ واقعہ جس میں حضرت عمرؓ نے انھیں ایک چپت رسید کی یہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کچھ محتاط آدمی نہ تھے۔ اس کے باوجود ان سے اس قدر احادیث مروی ہیں؟

(۵) کائنات میں ناقص چیزیں کیوں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح سے شر کا وجود کیوں ہے؟ جو آدمی آفاقی دلائل برالوہیت پر غور کرتا ہے، یہ آثار بظاہر تو الوہیت کے متضاد ہیں۔ اصل صورت حال کیا ہے۔

(۶) شیعہ حضرات، جو اکابر صحابہ پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں، اس کی بنیاد کیا ہے؟ آخر وضیح احادیث کی موجودگی میں وہ کیونکر اپنی ہٹ پر قائم رہ سکتے ہیں؟

(۷) امام بخاریؒ کے سوانح کو جاننے کے لیے مستند اور ہر قسم کے شبہ سے بالا ذرائع کون کون سے ہیں؟

(۸) حضرت عائشہؓ سے آپؐ کی اتنی چھوٹی عمر میں شادی کرنے میں کیا مصلحت تھی؟

(۹) قرآن مجید میں جو آیات متشابہات ہیں ان کے بیان میں کیا مصلحت ہے؟ جب کہ وہ ہماری سمجھ و احساس سے بالا ہیں۔ اور ہمیں معنوی لحاظ سے آخر ان سے کیا فائدہ پہنچتا ہے؟

جوابات

انسان کی فطرت اور اس کا طرز عمل

۱۔ اس امر میں تو شبہ نہیں ہے کہ دنیا میں نیکی اور بھلائی کی زندگی بسر کرنے والے ہمیشہ تھوڑے ہی رہے ہیں، اکثریت ہمیشہ حق سے منحرف ہو کر زندگی بسر کرنے والوں ہی کی رہی ہے، لیکن اس صورت حال کو اس چیز کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا کہ انسان کی فطرت ہی بری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں

ایک طرف یہ بات صحیح ہے کہ دنیا میں ہمیشہ برائی کی زندگی بسر کرنے والوں ہی کی اکثریت رہی ہے وہیں یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ جہاں تک پسند کرنے کا تعلق ہے دنیا میں ہمیشہ نیکی کی زندگی پسند کرنے والوں کی اکثریت رہی ہے۔ جو لوگ رات دن ظلم، ناانصافی، خیانت، بدعہدی، بدکاری، اور فسق و فجور میں مبتلا ہیں اگر ان سے بھی آپ دریافت کیجیے کہ وہ ایمان داری کے ساتھ بتائیں کہ ظلم اور انصاف، بخل اور فیاضی، جھوٹ اور سچ، خیانت اور امانت، غرور اور تواضع میں سے کس چیز کو وہ پسند کرتے ہیں تو انشاء اللہ ان کی عظیم اکثریت جو جواب دے گی وہ ظلم کے مقابل میں انصاف، بخل کے مقابل میں فیاضی اور جھوٹ کے مقابل میں سچ کے حق میں ہوگا۔ اب سوچیے کہ اگر انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے شر پسند ہے اور اپنی عملی زندگی سے وہ اسی چیز کا ثبوت بھی مہیا کر رہا ہے تو آخر اس کی پسند اور ناپسند کا معاملہ اس کے اس طرز عمل سے بالکل مختلف کیوں واقع ہوا ہے؟

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ محض روایات اور عام خیالات کا رعب ہے کہ جہاں تک پسندیدگی کے اظہار کا تعلق ہے انسان وہ نیکی کے حق میں کر دیتا ہے ورنہ وہ پسند بھی درحقیقت برائی ہی کو کرتا ہے تو یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ جب دنیا میں برائی کی راہ چلنے والوں ہی کی اکثریت ہے تو نیکی کے حق میں یہ فضا کس چیز نے پیدا کر رکھی ہے کہ برائی کی زندگی بسر کرنے والوں کے سامنے بھی اگر برائی اور بھلائی دونوں کو سامنے رکھ کر ان سے پوچھیے کہ ان میں سے کس کو ترجیح دیتے ہو تو وہ اپنا ووٹ بھلائی ہی کے حق میں ڈالیں گے۔ روایات تو عمل سے قائم ہوتی ہیں جب اکثریت کا عمل برا ہے تو نیکی کے حق میں یہ روایت کس طرح قائم ہو گئی کہ عادی سے عادی چور بھی چوری کی تعریف سے گریز کرتا ہے اور ایمان داری کی زندگی کی تعریف کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک آدمی کا اپنے عمل کے بالکل خلاف نیکی کے حق میں شہادت دینا صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ برائیوں میں مبتلا رہنے کے باوجود بھی اس بات کو جانتا ہے کہ برائی کی یہ زندگی اس کی اپنی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اپنی ہر برائی پر خود اپنے ضمیر کو (جب تک وہ بالکل مردہ نہ ہو چکا ہو) ملامت کرتے ہوئے پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے اسی ضمیر اور اپنی اسی فطرت پر دوسروں کے ضمیر اور دوسروں کی فطرت کو بھی قیاس کرتا ہے اس وجہ سے قدرتی طور پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے بھی خواہ وہ عملاً کتنی ہی فاسقانہ زندگی بسر کریں، پسند وہ عفت اور پاکدامنی ہی کی زندگی کرتے ہیں، یہ چیز اس کو

مجبور کرتی ہے کہ خواہ اس کی اپنی زندگی کتنی ہی برائیوں میں مبتلا ہو لیکن وہ تعریف نیکی ہی کی کرے تاکہ دوسروں کی نظروں میں وہ ذلیل و حقیر بن کے نہ رہ جائے۔ انسان کی اسی فطرت کی بنا پر قرآن مجید نے کہا ہے کہ، بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (انسان خود اپنے خلاف گواہ ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے۔)

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ انسان کی فطرت کی نیکی پسندی کا لازمی تقاضہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ برائی کی راہ نہ اختیار کرے یا نہ اختیار کر سکے۔ آخر انسان کی فطرت حیوانات کی جبلت کی طرح تو نہیں ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہی نہ ہو سکے۔ حیوانات تو قدرت کی طرف سے ایک مخصوص ڈگر پر ہانک دیئے گئے ہیں وہ اس ڈگر سے انحراف اختیار نہیں کر سکتے لیکن انسان کی سرشت پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو قدرت نے اس کو اچھی فطرت پر پیدا کیا ہے یعنی اس کو بھلائی اور برائی کا امتیاز بخشا ہے اور بھلائی کی قدر اس کے اندر ودیعت کی ہے۔ دوسری طرف اس کو اختیار اور آزادی کی نعمت بھی بخشی ہے۔ یعنی وہ بھلائی اور برائی کی ان دونوں راہوں میں سے کسی ایک راہ کو اختیار کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ وہ ان میں سے ہر راہ کو اختیار کرنے کے لیے آزاد ہے۔ وہ اپنے انتخاب سے چاہے بھلائی کی راہ اختیار کرے چاہے برائی کی۔

اب رہا یہ سوال کہ بھلائی اور برائی کے امتیاز رکھنے اور بھلائی کو پسند کرنے کے باوجود انسانوں کی اکثریت برائی میں کیوں مبتلا پائی جاتی ہے تو اس کا بہترین جواب وہ سمجھ میں آتا ہے جو قرآن نے دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر برائی چونکہ نفس کے لیے اپنے اندر ایک فوری لذت یا جلدی حاصل ہو جانے والا نفع رکھتی ہے اس وجہ سے انسان برائی کو برائی سمجھنے کے باوجود اس میں آلودہ ہو جاتا ہے۔ برعکس اس کے بھلائی کے جو کام ہیں ان کے ساتھ اس طرح کی فوری لذتوں کی کوئی چاٹ نہیں ہوتی اس وجہ سے عام لوگ ان کو ایک اعلیٰ نصب العین تسلیم کرنے کے باوجود ان کے لیے ہمت نہیں کرتے۔

اس بات کو آپ دوسرے لفظوں میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ بھلائی اور نیکی کے کاموں کی فطرت قدرت نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ ان کے انجام دینے کے لیے ہمارے نفس کو ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے جس کے لیے عزم و ہمت کی ضرورت ہے اور اس عزم و ہمت کو پیدا کرنے کے لیے آدمی کو اپنی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ برعکس اس کے برائی کے کاموں کے لیے آدمی کو اپنے نفس کو اس کی خواہشات کے

بہاؤ پر چھوڑ دینا کافی ہوتا ہے، اس کے لیے کسی ریاضت یا کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کوچہ میں ہر شخص آسانی سے تیس مار خاں بن سکتا ہے۔

آپ غور کریں گے تو محسوس کریں گے کہ دنیا میں جتنے کام بھی کچھ قدر و قیمت رکھنے والے ہیں، سب ہی کسی نہ کسی حد تک مشقت طلب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لیے حوصلہ کرنے والے کم نکلتے ہیں اگرچہ ان کے ساتھ کسی نفع عاجل کی چاٹ بھی ہو۔ آپ جس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس طبقہ کے کتنے افراد وہ لائن اختیار کرتے ہیں جو آپ نے اختیار کی ہے۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ دوسری لائنوں کے مقابل میں اس لائن میں ذرا مشقتیں زیادہ ہیں۔ حالانکہ دنیوی نقطۂ نظر سے اس کے فوائد واضح ہیں۔

اسی پر قیاس نیکی اور بدی کے کاموں کو کر لیجیے۔ ایک میں محنت فوری اور نفع ادھار ہے، دوسرے میں محنت تھوڑی اور لذت عاجل ہے اس وجہ سے پہلے کی طرف (اس کے پسندیدہ ہونے کے باوجود) کم لوگ توجہ کرتے ہیں اور دوسرے پر (اس کے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود) ایک خلقت ٹوٹی پڑتی ہے۔ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ عشقیہ ناولوں کے پڑھنے کے مقابل میں فلسفہ کا مطالعہ ایک عمدہ کام ہے، عقلاً بھی اور نقلاً بھی۔ لیکن فلسفہ کے مقابل میں آپ کو ناول پڑھنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ملے گی اور لطف یہ کہ وہ اعتراف بھی کریں گے کہ یہ محض وقت کی بربادی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب یہ وقت کی بربادی ہے تو اس مشغلہ شریف میں کیوں وقت برباد کرتے ہیں؟ محض اس وجہ سے کہ تھوڑی دیر کے لیے نفس کو اس سے تھوڑا سا سرور حاصل ہو جاتا ہے۔

جو حقیقت میں بیان کر رہا ہوں اس کو سب سے زیادہ دل نشین انداز میں تو قرآن، حدیث، امثال سلیمان اور انجیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن میں آپ لوگوں کے ماحول اور ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں ارسطو کی وہ تقریر اپنے لفظوں میں پیش کرتا ہوں جو اس نے اسی سوال پر بحث کرتے ہوئے کی ہے۔

ارسطو کے نزدیک انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے اگرچہ نیکی پسند واقع ہوا ہے لیکن اس کے باوجود وہ عملاً برائی میں جو زیادہ مبتلا پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی کی فطرت وحدت اور بدی کی فطرت انتشار کی متقاضی ہے۔ اگر آپ نیکی کی زندگی بسر کرنا چاہیں تو آپ کو کوشش کر کے اپنی تربیت اس طرح کرنی پڑے گی کہ آپ کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں ایک متعین ہدف پر استعمال ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز

تربیت و ریاضت کی محتاج ہے۔ برعکس اس کے بدی کی زندگی گذارنے کے لیے اس قسم کی کوئی زحمت آپ کو اٹھانی نہیں پڑے گی بلکہ اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو مطلق العنان چھوڑ دینا کافی ہوگا۔

وہ اس حقیقت کو مثالوں سے یوں واضح کرتا ہے کہ اگر ایک آدمی ماہر نشانچی بننا چاہے تو لازماً اسے ایک مدت تک ایک متعین ہدف پر نشانہ بازی کی مشق کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایک مشکل کام ہے۔ برعکس اس کے اگر ایک شخص اپنا نصب العین یہ قرار دے لے کہ جہاں بھی تیر لگ جائے وہی نشانہ ہے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس معنی میں ہم اور آپ سب ہی نشانچی ہیں۔ اب دیکھیے کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے تو ہم میں سے ہر شخص پہلے مفہوم میں نشانچی بننے کا شوق اور ولولہ رکھتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے ہماری اکثریت ویسے ہی نشانچیوں پر مشتمل ہے جن کا نظریہ یہی ہے کہ جہاں تیر لگ جائے وہی نشانہ ہے۔

ارسطو نے یا کسی اور فلسفی نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ایک اور مثال دی ہے وہ بھی اچھی خاصی بصیرت افروز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ایک چشمہ کے پانی کو نشیب فراز کی نالیوں سے گذارتے ہوئے کسی چمن تک پہنچانا ہو تو یہ کام ایک اعلیٰ کام ہے اور انسان کو بالطبع یہ پسند ہے لیکن ساتھ ہی یہ مشقت طلب بھی ہے لیکن اگر مقصود یہ ہو کہ چشمہ کا پانی جدھر چاہے پھیل جائے تو اس کے لیے نہ کسی محنت کی ضرورت ہے نہ کسی انجنیرنگ کی۔ اگرچہ اس صورت حال کو پسند کوئی بھی نہیں کرتا، سب ہی اس کو ضیاع اور بربادی سمجھتے ہیں لیکن عملاً اکثریت کے طرز عمل کا نتیجہ یہی نکل رہا ہے۔

نیکی اور بدی کی یہی فطرت ہمارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمائی کہ حفت الجنة بالمکارہ وحفت النار بالشہوات۔ (جنت مشکلات سے گھیر دی گئی ہے اور دوزخ مرغوبات سے گھیر دی گئی ہے) اسی بات کو سیدنا مسیح علیہ السلام نے یوں واضح فرمایا ہے کہ بدی کی راہ فراخ اور کشادہ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں۔

یہاں پہنچ کر مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر خدا نے نیکی کی راہ کو مشکل کیوں بنا دیا، اس کو بھی بدی ہی کی طرح لذیذ اور نفع عاجل بخشنے والی کیوں نہیں بنا دیا؟ اگر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو تو آپ اس کے ساتھ ہی اس سوال پر بھی غور کیجیے کہ انجنیرنگ کا فن اتنا مشکل کیوں بنا دیا گیا ہے اسے بھی ناول کی طرح لذیذ اور مرغوب کیوں نہیں بنا دیا گیا؟ جو جواب آپ کا

ذہن اس سوال کا دے وہی جواب بعینہٖ پہلے سوال کا بھی صحیح ہوگا۔

جس طرح بدی میں انسانوں کی اکثریت کا مبتلا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ بدی ہی انسان کی فطرت ہے اسی طرح شرک میں انسانوں کی اکثریت کا مبتلا ہونا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ شرک ہی انسان کی فطرت کا مقتضیٰ ہے۔ اس معاملہ میں بھی عقل اور فطرت کے مطابق بات وہی ہے جو قرآن کہتا ہے۔ یعنی انسانی فطرت کا اصل تقاضا تو توحید ہی ہے لیکن اپنی بعض کمزوریوں اور کج فہمیوں کے سبب سے آدمی شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

میں آپ کے سوال کے اس حصہ کا بھی جواب دینے کی کوشش کرتا لیکن بعینہٖ اسی سوال پر میں نہایت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب حقیقت شرک کی دو آخری فصلوں میں بحث کر چکا ہوں۔ ان فصلوں کے عنوان ہیں "کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟" "شرک کے پیدا ہونے کے حقیقی اسباب" ان دونوں فصلوں میں میں نے اس مسئلہ سے متعلق فلسفہ جدید کی غلطیاں بھی واضح کی ہیں اور اکثریت کے طرز عمل سے جو شبہ ایک عام آدمی کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ محترم مستفسر سے گذارش ہے کہ میری مذکورہ کتاب حاصل کر کے وہ یہ فصلیں ضرور پڑھ ڈالیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کے ذہن کی تمام الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ (باقی آئندہ)

بقیہ واپسی

سامان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے جہاز کی سیڑھیوں پر قدم رکھنا چاہا تو ایک نوجوان جو حاجیوں کو سوار کرانے کے سلسلہ میں کچھ رضاکارانہ خدمات انجام دے رہے تھے، ہنس کے بولے کہ میں ابھی آپ کو جہاز پر جانے نہیں دوں گا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ وہ مسکراتے ہوئے بولے کہ آپ درجہ اول کے مسافر ہیں، آپ کا کیبن تو محفوظ ہے، اس پر کون قبضہ کر سکتا ہے؟ میں ان کی اس مخلصانہ فہمائش کے بعد اپنی جگہ پر آ کے کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ہلا جب تک انھوں نے بڑے پیار سے مجھے یہ دعوت نہیں دی کہ "اب آ جائیے، اب راستہ صاف ہے"۔ میں نے مسکراتے ہوئے زینہ پر قدم رکھا، ان سے مصافحہ کیا اور جہاز کے عرشہ پر پہنچ گیا۔

(باقی)

اجتماعیات و سیاسیات

ریاست کا اسلامی تصور

ریاست کا اسلامی تصور اس اصطلاح کے اندر چھپا ہوا ہے جو اسلام نے ریاست کی تعبیر کے لیے اختیار کی ہے۔ اسلامی لٹریچر پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام نے اپنے اصولوں پر قائم شدہ سیاسی تنظیم کے لیے ریاست یا سلطنت یا حکومت کی اصطلاحیں نہیں اختیار کی ہیں بلکہ خلافت یا امامت یا امارت کی اصطلاحیں اختیار کی ہیں اس وجہ سے ریاست کا اسلامی تصور واضح کرنے کے سب سے پہلے ان اصطلاحات پر غور کرنا اور ان کے مضمرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

خلافت اور امارت میں فرق خلافت، امامت اور امارت کی اصطلاحیں ہماری فقہ و کلام کی بعض کتابوں میں بالکل مترادف اسلامی اصطلاحات کی حیثیت سے استعمال ہو گئی ہیں جس کے سبب سے بعض اوقات غلط مبحث سا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ان اصطلاحات کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لیے استعمال ہوئی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے ارادوں کی تنفیذ کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھیے کہ جو فرق STATE اور GOVERNMENT کے درمیان ہے اسی قسم کا فرق خلافت اور امامت و امارت کے درمیان ہے۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہوئی کہ ریاست کا اسلامی تصور سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ حقیقت ملحوظ رکھنی ہے کہ اسلام میں ریاست محض ایک ریاست نہیں ہے بلکہ وہ خلافت ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی ہوگی کہ کسی چیز کا صحیح تصور اس کی معیاری شکل ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے اس وجہ سے خلافت کی بھی یہاں صرف معیاری شکل ہی زیر بحث ہے۔ اس کی بگڑی ہوئی شکلیں، جن کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں، اس بحث میں ہمارے لیے کارآمد نہیں ہو سکتیں۔

خلافت کی اصل فطرت انسانی کے اندر اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے اس خلافت کا سراغ انسانی فطرت اور انسانی معاشرہ کے اندر لگانا چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس بارہ میں اسلام نے ہمیں اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے کہ سیاسی فلسفیوں کی طرح انسان کے ابتدائی سیاسی تصورات سے متعلق ہمیں اٹکل کے تیر تکے چلانے پڑیں بلکہ وحی الٰہی نے ہمارے سامنے ایک واضح علم الانسان بھی رکھ دیا ہے جس سے ہم اس خلافت کی اصل اور ابتدا بھی معلوم کر سکتے ہیں اور اس کی روشنی میں اس کے بنیادی تصورات بھی سمجھ سکتے ہیں۔ میں یہاں اس علم الانسان کو قرآن سے اخذ کر کے اپنے الفاظ میں مختصر طور پر پیش کرتا ہوں۔

قرآن میں اس خلافت کی ابتدا اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کرنا چاہا تو سب سے پہلے فرشتوں کے سامنے اپنے اس ارادہ کا اظہار فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں کے علم میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم نہیں تھی اس وجہ سے ان کے حلقہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر اس نئی مخلوق کے پیدا کرنے سے مقصود اللہ تعالیٰ کا محض یہ ہوتا کہ یہ اس کی تسبیح و تقدیس کرے تو اس کو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کام کے لیے تو پہلے سے ہم موجود ہی ہیں۔ لازماً یہ مخلوق خدا کے نائب کی حیثیت سے اس زمین کا انتظام و انصرام سنبھالے گی اور اس کے خلیفہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کو خدا کی طرف سے کچھ اختیارات بھی تفویض ہوں گے۔ پھر یہیں سے ان کو یہ اندیشہ بھی ہوا کہ اگر اس مخلوق کو اختیار بھی ملا تو یہ زمین میں عدل و انصاف کے بجائے خونریزی اور فساد برپا کرنے والی مخلوق بن جائے گی۔ اپنا یہ اندیشہ فرشتوں نے ایک سوال کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جواب دیا کہ یہ شبہ تمہیں صرف

اس وجہ سے لاحق ہوا ہے کہ تمہاری نظر میری پوری اسکیم پر نہیں ہے۔ چنانچہ ان کو آدم کی ذریت کا مشاہدہ کرایا گیا اور پھر ان سے سوال کیا گیا کہ اگر آدم اور ان کی اولاد کے بارہ میں تمہارا یہ گمان صحیح ہے تو بتاؤ، یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب کے سب زمین میں فساد ہی برپا کرنے والے ہیں، یا ان میں نیکی اور انصاف پھیلانے والے بھی ہیں؟ فرشتوں نے نہایت ادب کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ انھیں اس بارہ میں کوئی علم نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو (جو پہلے سے اپنی ذریت کے ناموں سے واقف ہو چکے تھے) حکم دیا کہ وہ اپنی ذریت کے نام ان فرشتوں کو بتائیں۔ آدمؑ نے فرشتوں کو اپنی ذریت کے ناموں سے آگاہ کیا اور ان کی نسل میں جو انبیاء و رسل اور جو مجددین و مصلحین پیدا ہونے والے تھے ان کا تعارف کرایا۔ اس سے فرشتوں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آدم اور اولاد آدم کو جو خلافت عطا ہو رہی ہے اگرچہ وہ اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ عطا ہو رہی ہے، جس سے خرابی کے بھی اندیشے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس اختیار و ارادہ کی حد بندی اور انسان کی اصلاح و تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب و شریعت بھی نازل فرمائے گا اور اپنے نبی اور رسول بھی بھیجے گا۔ اس انکشاف سے فرشتوں پر اللہ تعالیٰ کی اسکیم واضح ہو گئی اور وہ مطمئن ہو گئے۔

خلافت کے تضمنات قرآن نے تاریخ انسانی کے اس بالکل ابتدائی ماجرے کو محض ایک کہانی کے طور پر نہیں سنایا ہے بلکہ اس کے سنانے سے اصل مقصود چند اجتماعی و سیاسی حقیقتوں کی ابتدا کا سراغ دینا ہے۔ اس سے خلافت کے تصور سے متعلق جو حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ایک یہ کہ خلافت کا شعور خود انسانی فطرت کا بروز ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان کو خارج سے لاحق ہو گئی ہو بلکہ خدا نے خود اس کو اس منصب کے لیے پیدا کیا ہے اور خود ہی اس کا شعور اس کے اندر ودیعت کیا ہے۔ وہ جب سے بھی اس دنیا میں ہے اس شعور کے ساتھ ہے اور اسی شعور نے اس کو سیاسی زندگی اختیار کرنے پر اکسایا ہے۔ اس نے سیاسی زندگی مصنوعی طور پر نہیں اختیار کی ہے اور نہ بے ضرورت اختیار کی ہے بلکہ یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے جس کے پورا ہوئے بغیر اس کی شخصیت کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔

دوسری یہ کہ اس زمین پر انسان کا فطری منصب ایک بالکل خود مختار اور مطلق العنان ہستی کا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور نائب کا ہے۔ اس کو ایک خاص دائرہ کے اندر تصرف کا اختیار ضرور حاصل ہے لیکن یہ اختیار اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا تفویض کردہ ہے۔ اس وجہ سے اس کا وہی تصرف جائز اور معقول ہے جو خدا کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہو، ان سے ہٹ کر نہ ہو۔ اس نیابت کے تصور کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کو اپنے ہر اس تصرف کے لیے جواب دہی کرنی پڑے گی جو اصل مستخلِف یعنی اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہو۔

تیسری یہ کہ اس زمین میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، نہ کہ انسانوں کی۔ اس میں قانون سازی اور تصرف کے جو اختیارات انسانوں کو حاصل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے تحت ہیں یا پھر ان دائروں کے اندر ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے۔

چوتھی یہ کہ منشائے تخلیق کے اعتبار سے تو اس منصب کے اہل سارے ہی انسان ہیں، اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ بھی ہر ایک کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان اس منصب پر مجبور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس کو اختیار کرے اور نہ چاہے تو نہ اختیار کرے۔ وہ خدا کے حدود کا پابند رہ کر اس کا خلیفہ بھی بن سکتا ہے اور ان حدود سے آزاد ہو کر اس کا باغی بھی بن سکتا ہے۔ جس طرح ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا تو کیا ہے اپنی بندگی ہی کے لیے لیکن کسی کو اس بندگی پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ ہر ایک کو آزاد چھوڑا ہے، وہ بندگی کرے یا نہ کرے، اسی طرح اس خلافت پر بھی اس نے کسی کو مجبور نہیں کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس منصب کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں انسان اگر اس اسکیم کی پابندی نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پسند فرمائی ہے تو انسان کا فساد اور خوں ریزی میں مبتلا ہو جانا بہت اقرب ہے۔

چھٹی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مبہم نہیں چھوڑا ہے کہ وہ اپنی زمین کے انتظام کے سلسلہ میں کس چیز کو پسند کرتا ہے اور کس چیز کو پسند نہیں کرتا۔ یہ عین منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی پسند و ناپسند اور اپنے احکام و ہدایات سے باخبر رکھنے کا انتظام کرے۔ چنانچہ فرشتوں کو جو شبہ تھا کہ انسان خلافت پا کر فساد و خوں ریزی میں مبتلا ہو جائے گا

وہ اسی بات سے دور ہوا کہ اولاد آدم میں نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی جاری ہوگا اور ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی کتابیں اور اپنی شریعت بھی نازل فرمائے گا۔

ساتویں یہ کہ خلافت کی اساس قوم یا وطن یا نسل اور نسب کے تصورات پر نہیں ہے بلکہ یہ اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک اصولی اور جہانی ریاست ہے۔

آٹھویں یہ کہ یہ نظام کامل مساوات کے اصول پر قائم ہے۔ اس میں خلافت کا منصب کسی خاص شخص، یا گروہ، یا طبقہ کو حاصل نہیں ہے بلکہ اصلاً ہر شخص کو حاصل ہے۔ اس میں اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل ہوتی ہے تو وہ محض اہلیت و صلاحیت کی بنا پر اور یہ بھی سب کے مشورہ اور مرضی سے۔

خلافت کے لیے سنت اللہ اوپر ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ خلافت اختیار پر مبنی ہے نہ کہ جبر پر۔ اس اختیار کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ مختلف قوموں کو زمین میں اقتدار بخشے اور یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کرے کہ وہ زمین میں اپنی من مانی چلاتی ہیں یا اس اقتدار کو خدا کے مقرر کردہ حدود کا پابند رکھتی ہیں۔ جو قومیں اس اقتدار کو پاکر خدا سے بغاوت کی روش اختیار کرتی ہیں وہ مجرم قرار پاتی ہیں اور امتحان کی مقررہ مدت گذار چکنے کے بعد وہ فنا کر دی جاتی ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا ذکر سورہ یونس کی آیات ۱۳-۱۴ میں اس طرح فرمایا ہے:

"اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ انھوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ایسا ہی بدلا دیتے ہیں ہم مجرموں کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد زمین میں تم کو خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔"

خلافت کے حقیقی اہل یہ خلافت بالقوہ اگرچہ سارے ہی انسانوں کو حاصل ہے لیکن بالاستحقاق یہ صرف ان کو حاصل ہے جو اس کا حق ادا کریں۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اس لیے کہ ان کی حکومت اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق تھی۔

"اے داؤدؑ، ہم نے تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تو تم لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔" ص - ۲۶

اس خلافت کے حقیقی اہل درحقیقت انبیاء علیہم السلام ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر اس کی ذمہ داریاں ادا کریں۔ جو لوگ خدا کی بندگی اور اطاعت کے لیے منظم ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اس خلافت کا خاص خلعت عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا ہے:-

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں اسی طرح خلافت دے گا جس طرح اس نے ان کے اگلوں کو دی اور ان کے لیے ان کے اس دین کا بول بالا کرے گا جس کو ان کے لیے پسند فرمایا۔ اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھیرائیں گے۔"

خلافت کا بگاڑ یہی خلافت کی معیاری شکل ہے۔ جب تک یہ اپنی ان خصوصیات پر باقی رہے یہ زمین کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ یہ خصوصیات اگر کم ہونی شروع ہو جائیں تو یہ اس کے بگاڑ کی صورتیں ہوں گی اور اس بگاڑ کے مختلف درجے ہیں۔ ایک خاص درجہ تک یہ بگاڑ اس کو خلافت کے دائرہ سے خارج نہیں کرتا لیکن اگر یہ بگاڑ اس کی بنیادی خصوصیات کو ختم کر دے تو پھر یہ خلافت نہیں باقی رہ جاتی بلکہ بغاوت اور فساد فی الارض بن جاتی ہے۔

خلافت اور ایک عام ریاست میں فرق اس تفصیل کے بعد یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا کہ ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست (بالفاظ دیگر خلافت) میں کس اعتبار سے اشتراک اور کن پہلوؤں سے اختلاف ہے۔ ارسطو نے انسان کی یہ جو تعریف کی ہے کہ "وہ حیوان ناطق ہے" یہ تعریف جس طرح ایک غیر مسلم پر صادق آتی ہے اسی طرح ایک مسلم پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ اپنے مادی اور جبلتی دائروں میں دونوں ایک ہی طرح کی ضروریات اور ایک ہی قسم کے داعیات رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر شخص جانتا ہے کہ ....

ایک مسلم اور ایک غیر مسلم دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک غیر مسلم کے اصول زندگی اور ہیں اور ایک مسلم کے اصول زندگی اور ہیں۔ اسی طرح ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست میں بھی جہاں تک ان کے ظاہری ڈھانچہ اور ان کے مادی اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ایک

(باقی صفحہ [illegible] پر)

تقریظ و تنقید

قادیانیت

مطالعہ — و جائزہ

تصنیف :۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ صفحات ۲۲۸ ۔ قیمت چار روپے

پتہ : مکتبہ دینیات ۱۴۴ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

ہمارے پاس تبصرہ کے غرض سے بہت سی کتابیں آئی ہوئی پڑی ہیں لیکن ہم ان پر کچھ لکھنے کے لیے اب تک وقت نہ نکال سکے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں ہمیں خود پڑھنے کی فرصت ملتی نہیں اور کسی دوسرے ایسے شخص کا اب تک ہمیں تعاون نہیں حاصل ہو سکا جس کی رائے پر کتابوں کے باب میں ہمیں پورا پورا اطمینان ہو ۔ کتابیں بھیجنے والے حضرات کو قدرتی طور پر اس تاخیر سے شکایت ہے اور ہمیں ان کی اس شکایت کا احساس بھی ہے لیکن ہم نے ان کی ناراضگی کو برداشت کر لینا گوارا کیا لیکن اس بات پر طبیعت کسی طرح آمادہ نہیں ہوئی کہ ان کتابوں پر نظر ڈالے بغیر ہی ہم ان کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنے کی ذمہ داری اٹھالیں ۔

زیر نظر کتاب کو ہماری نظر میں یہ امتیازی درجہ حاصل ہے کہ جوں ہی یہ موصول ہوئی ، اس کے عنوان ، اس کے مصنف کے نام اور اس کی دلکش کتابت و طباعت ، ہر چیز نے ہمیں اس کے پڑھنے پر اکسایا ۔ چنانچہ دو تین نشستوں ہی میں ہم نے پوری کتاب ختم کر ڈالی ۔ اس کو پڑھنے کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ قادیانیت سے متعلق پروفیسر الیاس برنی مرحوم کی مشہور کتاب کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جو ہر طبقہ کے لوگوں کے مطالعہ کے لائق سامنے آئی ہے ۔

یہ کتاب اگرچہ اپنے موضوع و مقصد کے لحاظ سے مناظرہ سے تعلق رکھنے والی ہے لیکن شروع سے

در جہاں خوابگاہ نتواں کرد — خواب بر راہ و چاہ نتواں کرد
روز پیری ز میسد سر برد ار — خواب خوش در پگاہ نتواں کرد
مرد بے دستگہ کند کاشت — آنچہ با یک سپاہ نتواں کرد
آنچہ با یک سخن تواں کردن — با ہزاراں سپاہ نتواں کرد
پس دیوار ہم نشاید کرد — آنچہ در پیش گاہ نتواں کرد
کار از بہر کار باید کرد — از پئے واہ واہ نتواں کرد
مرد آزادہ را کہ شاہ خود است — بندۂ بادشاہ نتواں کرد
جز بدرگاہ ایزد یکتا — پشت خود را دو تاہ نتواں کرد

بہر حال یہ مجموعہ نہایت مفید مضامین پر مشتمل ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کی قدر کی جائے گی ۔ ایک چیز لوگوں کو کھٹکے گی ۔ وہ یہ کہ ٹائپ کی غلطیاں بہت رہ گئی ہیں ان کی تصحیح کا اہتمام کرنا تھا ۔

بقیہ ریاست کا اسلامی تصور

عام ریاست جس طرح اپنے وجود پذیر ہونے کے لیے اس امر کی محتاج ہے کہ اس کو ایک انسانی معاشرہ حاصل ہو ، اس کے قبضہ میں ایک مخصوص علاقہ ہو ، وہ داخلی طور پر با اقتدار اور بیرونی حیثیت سے خود مختار ہو ، اس کے پاس ایک سیاسی ادارہ (گورنمنٹ) ہو جو اس کے ارادوں کی تنفیذ اور اس کے مقاصد کی تکمیل کر سکے اسی طرح اسلامی ریاست یا خلافت بھی اپنے وجود پذیر ہونے کے لیے ان ساری چیزوں کی محتاج ہے ۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن جہاں تک دونوں کے اصول اور مقاصد کا تعلق ہے دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے ۔

- **خریدار حضرات** ، خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں ورنہ تعمیل نہ ہوگی ۔ (مینجر)

جامعۂ اردو علی گڑھ کے کنووکیشن کے موقع پر جامعۂ اُردو کا ترجمان

ماہنامہ ادیب علی گڑھ

اپنی پہلی خصوصی اشاعت مصوّر

جامعۂ اردو کا بیس سالہ نمبر

پیش کر رہا ہے

۸ مارچ ۱۹۶۰ء کو شایع ہو رہا ہے

۸ رجون ۱۹۶۰ء کو دوسرا ضخیم نمبر شبلی نمبر شایع کیا جا رہا ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین، گوپی ناتھ امن، محمد طاہر فاروقی۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، پنڈت سندرلال، مولانا حفظ الرحمٰن، سید ظہیر الدین علوی۔ حامد حسن قادری۔ راہی معصوم رضا شبنم سبحانی اور دوسرے نمایاں اہل قلم شرکت کر رہے ہیں۔ قیمت دو روپے۔ زرسالانہ: ساڑھے پانچ روپے۔

نوٹ:۔ ادیب سال میں ایسے ہی چار ضخیم نمبر اسی سالانہ قیمت میں پیش کرتا رہے گا۔] مینیجر ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ ۲

ماہنامہ اسلامی دُنیا دیوبند

جس میں ہر ماہ جلیل القدر علماء دیوبند کی زیر سرپرستی ایک مستند عالم کا کیا ہوا بخاری شریف کا اردو ترجمہ اور عام فہم تفہیم اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ (جن کے فضلائے علم نے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ اور مولانا انور شاہ صاحبؒ جیسی برگزیدہ ہستیوں کو جنم دیا) کی ایک نادر و نایاب تقریر پیش کی جا رہی ہے ——— اس کے علاوہ مولانا جامیؒ کی ایک نایاب تالیف شواہد النبوت کا اردو ترجمہ (ستۃ ھ کے ایک قلمی نسخہ سے) مشہور محدث امام ابن جوزی بغدادیؒ کی تالیف لطائف علمیہ کے اقتباسات، "الکرامات محمدیہ" "ارشادات حکیم الامت" اور دوسرے مفید اور دلچسپ علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی مضامین ہر ماہ ہدیۂ ناظرین کئے جا رہے ہیں۔

بیرون دیوبند کے حضرات نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ سالانہ قیمت:۔ پانچ روپے

فی پرچہ:۔ آٹھ آنے

پتہ:۔ ماہنامہ اسلامی دنیا دیوبند۔ یو۔ پی۔ (انڈیا)